مقدّر کا ستارہ

کلامِ اقبالؒ پر مبنی بچوں کے لیے کہانیاں

محمد نوید مرزا

مقدّر کا ستارہ

کلامِ اقبالؒ پر مبنی بچوں کے لیے کہانیاں

انتخاب
محمد نوید مرزا

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

ناشر

محمد سہیل عمر

ناظم اقبال اکادمی پاکستان

چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

Tel#: [92 42] 631 4510

Fax#: [92-42] 631 4496

Email: iqbalacd@lhr.comats.net.pk

Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 969-416-357-9

طبع اوّل: ۲۰۰۶ء

تعداد: ۱۰۰۰

قیمت: ۳۰۰ روپے

کمپوزنگ، صفحہ بندی

اور تصویریں: ایجوکیشنل ریسورس ڈیولپمنٹ سینٹر، کراچی

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

اس کتاب کی طباعت و اشاعت حکومت پنجاب، محکمہ اطلاعات و ثقافت
کی مالی معاونت کی بدولت ممکن ہوئی۔

تعارف

''مقدر کا ستارہ'' شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کے اُردو اور فارسی کلام پر مبنی بچوں کے لیے کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر کہانی اپنے اندر ایک ایسا پیغام رکھتی ہے جو نئی نسل کے لیے ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے۔ مختلف موضوعات پر یہ سبق آموز کہانیاں بچوں کے معروف ادیبوں کی تحریر کردہ ہیں جو اُن کی کتابوں اور بچوں کے رسائل کے اقبال نمبروں سے حاصل کی گئی ہیں۔ اپنے موضوعات اور فکری و تخلیقی حوالے سے یہ کہانیاں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ کیونکہ اقبالؒ کی شاعری کو سامنے رکھ کر بچوں کے لیے بہت کم لکھا گیا ہے۔ جو تحریریں منظرِ عام پر آئی بھی ہیں انھیں کبھی اس طرح خوبصورت طریقے سے کتابی صورت میں پیش نہیں کیا گیا، جس طرح اقبال اکادمی کی طرف سے جناب محمد سہیل عمر نے قارئینِ علم و ادب اور بچوں کے لیے پیش کیا ہے۔

اس کتاب میں جہاں علامہ اقبال کے مختلف اشعار کی روشنی میں تحریر کردہ کہانیاں ہیں، وہاں اقبالؒ کی اسلامی و تاریخی واقعات کے پس منظر میں بچوں کے لیے لکھی گئی اقبال کی نظموں کو بھی کہانی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ میں نے کہانیوں کے یہ تمام رنگ یکجا کر کے ''مقدر کا ستارہ'' میں شامل کر دیے ہیں اور پڑھنے والوں کے لیے معیاری اور منفرد تحریروں کا مجموعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی علمی و ادبی حیثیت تو ناقدین ہی متعین کر سکتے ہیں لیکن کہانیوں کے اس انتخاب کے حوالے سے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے اس کتاب میں ہر طبقۂ فکر کی دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تحریریں شامل کی ہیں تا کہ نئی نسل کے ساتھ ساتھ ہر عمر کے افراد اس کتاب کا مطالعہ کر سکیں۔

محمد نوید مرزا

فہرست

۱	عالم گیر بادشاہ اور شیر کی کہانی	ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی	۱
۲	خوش خبری	عائشہ عروج	۴
۳	ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا	ارشد سلیم	۱۱
۴	پہاڑ اور گلہری	فرزانہ یاسمین	۱۷
۵	خدا بخش اور خودی	محمد ادریس قریشی	۱۹
۶	یارب دلِ مسلم کو.....!	محمد عرفان رامے	۲۹
۷	میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو	محمد شعیب مرزا	۳۹
۸	فاطمہ بنتِ عبداللہ	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۴۸
۹	حادثہ یا زندگی کا نیا موڑ	اسما حبیب	۵۱
۱۰	مکڑا اور مکھی	فرزانہ یاسمین	۶۰
۱۱	زرخیز مٹی	محمد عثمان خان	۶۳
۱۲	یہ دیس میرا دیس	اشفاق احمد خان	۶۹
۱۳	اسرارِ خودی	ایم ایم صابر	۸۱

۱۴	بھٹکا ہوا سورج	شاہد انور شیرازی	۸۹
۱۵	سلطان مراد اور معمار کی کہانی	ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی	۹۴
۱۶	نیک جو راہ ہو	محمد فاروق دانش	۹۹
۱۷	راز	طارق ریاض خان	۱۰۹
۱۸	ہمدردی	سید شوکت علی گیلانی	۱۱۴
۱۹	ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے	ابنِ راز	۱۱۵
۲۰	نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں	محمد ناصر زیدی	۱۲۲
۲۱	میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو	نذیر انبالوی	۱۳۰
۲۲	ملاقات	محمد یوسف بالی	۱۳۷
۲۳	ایک گائے اور بکری	سید شوکت علی گیلانی	۱۴۵
۲۴	مقدر کا ستارہ	محمد نوید مرزا	۱۴۷

عالم گیر بادشاہ اور شیر کی کہانی

عالم گیر کا اصل نام اورنگ زیب تھا۔ وہ شاہ جہاں کا بیٹا تھا اور کئی باتوں میں اپنے دوسرے بھائیوں پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے زمانے کے نامور اساتذہ سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ اسے علم و فن سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ قرآن مجید کا حافظ تھا اور خطاطی کے فن میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ لڑکپن ہی سے اپنی بہادری کے لیے مشہور تھا۔ صرف چودہ برس کی عمر میں اُس نے ایک مست ہاتھی پر قابو پا کر اپنی بہادری کا لوہا منوالیا تھا۔ شہزادگی کے زمانے میں اس نے کئی جنگوں میں حصہ لیا اور یہ ثابت کر دیا کہ اس میں سپہ سالاری اور حکمرانی کی بے مثال صلاحیتیں موجود ہیں۔ تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی عالم گیر نے بہت سے ظالمانہ طریقوں کو ختم کیا اور عوام کی بہتری کے لیے کئی کام کیے۔ اس کے عہدِ حکومت میں لوگ بہت خوش حال تھے اور عدل و انصاف کا دور دورہ تھا۔ عالم گیر کے زمانے میں اسلامی شریعت پر عمل ہوا اور مسلمانوں کو بہت عزت ملی۔ کفر و اِسلام کی جنگ میں عالم گیر کی حیثیت ایک ایسے تیر کی تھی جو تیروں کے تھیلے کا آخری تیر تھا۔

عالم گیر ایک بادشاہ تھا۔ وہ چاہتا تو عیش و آرام کی زندگی گزار سکتا تھا، لیکن وہ درویشوں کی طرح سادہ زندگی گزارنا پسند کرتا تھا۔ اس نے شاہی خزانے کو اپنی ذات پر خرچ کرنے کی بجائے قرآنِ کریم کی کتابت کر کے روزی کمائی۔ عالم گیر کی ایک صِفت یہ بھی تھی کہ اُسے خدا پر بہت زیادہ بھروسا تھا۔ وہ اللہ کے سوا کسی سے

نہیں ڈرتا تھا۔ مشکل سے مشکل وقت میں بھی وہ ہمت نہیں ہارتا تھا۔ عالم گیر کے ایک واقعے سے اس کی بہادری اور خدا پر پکے بھروسے کا پتا چلتا ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ عالم گیر صبح سویرے نماز سے بھی پہلے جنگل کی سیر کو نکل گیا۔ اس وقت صبح کی ہَوا دل کو بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ یہ ہوا اسی طرح چلتی رہے اور وہ اسی طرح سیر کرتا رہے۔ اس ہَوا کی وجہ سے پرندے بھی بہت خوش تھے۔ وہ درختوں پر بیٹھے اپنی خوشی کا اظہار خدا کے نام کی تسبیح پڑھ پڑھ کر کر رہے تھے۔ ان کے چہچہانے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ ''حق ہو، حق ہو'' کا ورد کر رہے ہیں۔ ان کی یہ ''حق ہو'' عالم گیر کے لیے اس بات کا اشارہ تھی کہ یہ وقت خدا کی عبادت اور اسے یاد کرنے کا ہے۔ عالم گیر تو پہلے ہی اللہ کو یاد کرنے والا آدمی تھا۔ اب وہ اس

موقع پر کیوں کر پیچھے رہ سکتا تھا۔ چناں چہ وہ جنگل کا خوف کیے بغیر اسی وقت اور اسی جگہ پر نماز پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ خدا کی یاد میں اس قدر کھو گیا کہ اسے اس دنیا اور اس کی چیزوں کی کوئی خبر نہ رہی۔ اس وقت عالم گیر کا رُواں رُواں اللہ کی یاد میں محو تھا۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کے حضور جُھک جاتا ہے اور اسی کو سب سے بڑی طاقت سمجھ لیتا ہے تو اسے کسی کا بھی خوف نہیں رہتا اور خود اللہ تعالیٰ بھی اس شخص کی ہر طرح سے حفاظت فرماتا ہے۔ ہُوا یوں کہ جب عالم گیر نماز میں مشغول تھا تو ایک شیر کہیں سے پھرتا پھراتا ادھر آ نکلا۔ شاید وہ بہت بھُوکا تھا۔ اس لیے اس نے دھاڑ دھاڑ کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ انسان کی بُو سونگھتا ہوا عالم گیر کی طرف بڑھا۔ اس کا منھ دوسری طرف تھا اور نماز میں مصروفیت کے سبب اس کو دائیں بائیں کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ شیر نے اس پر حملہ کر دیا۔ عالم گیر چونکا، لیکن وہ نہ تو ڈرا اور نہ گھبرایا۔ اس نے فوراً اپنی تلوار نکالی اور ایک زبردست وار کر کے شیر کو وہیں ڈھیر کر کے رکھ دیا۔ پھر اسی طرح اللہ کی یاد میں کھو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

خوش خبری

''ارے تم اتنے اداس اور پریشان کیوں لگ رہے ہو، کیا بات ہے؟ کچھ دنوں سے میں تمھیں ایسے ہی دیکھ رہا ہوں۔'' پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے شاہین سے اس کے دوست کرگس نے سوال کیا۔ شاہین نے اپنی چونچ پروں میں سے نکالی۔ ایک نظر کرگس پر ڈالی اور پھر گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس خاموشی پر کرگس پھر گویا ہوا۔

''پہلے تو جب دیکھو فخر اور غرور کے ساتھ فضاؤں میں محوِ پرواز نظر آتے تھے۔ آج تمھاری وہ پہلے والی آن بان کدھر گئی۔ میں نے تمھیں پہلے کبھی اتنا اداس نہیں دیکھا۔ کچھ تو بتاؤ کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے؟''

شاہین نے دور فضاؤں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''تمھیں تو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پرندوں کا بادشاہ بنایا ہے اور یہی بات میرے

فخر و غرور کا باعث بنی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ خوشی مجھے اس وقت ہوئی جب بیسویں صدی کے عظیم مفکر علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں میری صفات کا ذکر کرنا شروع کیا۔''

کرگس ہمہ تن گوش شاہین کی باتیں سن رہا تھا۔ شاہین نے اپنی داستان آگے بڑھاتے ہوئے سلسلہ جاری رکھا۔

''علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ مسلمان اپنی عظمتِ رفتہ کو بھول کر غلامانہ زندگی گزار رہے تھے۔ جب انھوں نے میری صفات کا موازنہ اپنی زندگیوں سے کیا تو انھیں ہوش آ گیا۔ انھیں اپنی غلامانہ زندگی سے نجات حاصل کرنے کا فن سمجھ آ گیا۔ انھوں نے اپنی قوتِ بازو پر بھروسا کر کے انگریز کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ مسلمان اپنی ہمت، جوش اور جذبہ ایمانی کے ذریعے ایک خطۂ زمین حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔'' اتنا کہہ کر شاہین خاموش ہو گیا۔

''پھر کیا ہوا؟'' کرگس جو بڑی محویت سے ساری گفتگو سن رہا تھا، شاہین کی خاموشی پر بے چین ہو گیا۔

''پھر مسلمانوں نے اپنے عظیم مفکر کے تصور کو حقیقت کا روپ دے دیا اور اس ملک کے باشندوں نے اپنے قومی پرندے کا انتخاب کیا۔ جانتے ہو انھوں نے اپنا قومی پرندہ کونسا منتخب کیا؟'' شاہین نے اپنے دوست سے پوچھا۔

''بھئی مجھے تو ہر وقت پیٹ بھرنے کی فکر لگی رہتی ہے۔ ایسی بڑی بڑی باتیں تو

تمھیں ہی معلوم ہوتی ہیں۔ جب ہی تو انسانوں کے آئیڈیل ہو۔'' کرگس نے رشک بھری نظروں سے شاہین کو دیکھا۔

''وہ پرندہ تھا شاہین۔''

''تھا! کیا مطلب؟'' کرگس نے شاہین کے جملے میں سے ''تھا'' کو اچک لیا تھا۔

'' ہاں ابھی بتا رہا ہوں، سنتے جاؤ۔ دنیا بھر کے لوگ خصوصاً یہود و ہنود مسلمانوں کے اس ملک سے بہت خار کھاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ملک پر قبضہ کر کے انھیں پھر سے اپنا غلام بنا لیا جائے۔ اور اس سلسلے میں ان کا ہمسایہ تو بہت ہی جنونی ثابت ہوا ہے۔ اس نے تین بار 48ء 65ء اور پھر 71ء میں مسلمانوں کے پیارے ملک پر حملہ کیا۔ لیکن پاکستان کو دوبارہ ہندوستان بنانے کی اُس کی ناپاک سازش ہمیشہ ناکام ہوئی۔ دنیا نے شاہین صفت لوگوں کے کارنامے 65ء کی جنگ میں دیکھ لیے تھے اور 98ء میں پاکستان کے شاہینوں نے ایک اور بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔ اس کے بارے میں تو تمھیں علم ہی ہوگا؟'' شاہین نے سوال کیا۔

''نہیں مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ میں اس کارنامے سے بھی آگاہ نہیں ہوں۔ تم ہی بتاؤ 98ء میں پاکستان کے شاہینوں نے کیا کیا تھا؟ کرگس کو اپنی اس لاعلمی پر بہت افسوس ہوا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ میں کتنا بے خبر ہوں۔ اور یہ شاہین .....''

'' 98ء میں پاکستان کے شاہینوں نے اپنے پیارے ملک کو ایٹمی قوت بنا دیا تاکہ کوئی دشمن بھی اس کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھے۔ یہ دیکھ کر پاکستان کے

دشمنوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ تو پہلے ہی پاکستان کے ننھے شاہینوں کو اپنی تہذیب کی دلدل میں پھنسا رہے تھے، لیکن انھیں اب بھی خطرے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ ان بچوں کے سامنے اپنا قومی پرندہ شاہین موجود ہے۔ اگر کوئی کڑا وقت آن پڑا تو یہ اپنی عظمت کے روشن مینار یعنی اپنے قومی نشان کو سامنے رکھ کر ایک بار پھر اپنے کارناموں سے ہماری ناک میں دم کر دیں گے۔

ہر کوئی جانتا ہے کہ قومی نشان قوموں کی عظمت کے مینار ہوتے ہیں اور ان ہی میناروں کی روشنی میں قومیں ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہیں۔ لہٰذا دشمنوں نے ایک چال چلی۔ انھوں نے پاکستان پر دباؤ ڈالا اور پھر.....''

''پھر کیا ہوا..... جلدی بتاؤ نا۔'' کرگس بولا۔

''پھر پاکستان کا قومی نشان شاہین کی بجائے چکور ہو گیا۔'' شاہین کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ''اس پر بس نہیں، بلکہ اقبال کے شاہینوں کو نہ جانے کیا ہو گیا۔ کوئی بھی نہ بولا، کوئی احتجاج نہیں ہوا، نہ ہی اخبارات میں کوئی کالم لکھا گیا۔ سب خاموش رہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا، بلکہ کسی کو بھی معلوم نہ ہوا کہ اتنی جلدی ان کا قومی نشان بدل دیا گیا۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر بیٹھے ہیں۔ آج انھوں نے اپنا قومی نشان بدل لیا۔ کل اگر ان پر دباؤ ڈالا گیا تو کہیں وہ اپنا قومی پرچم، اپنا قومی ترانہ اور اپنا نقشہ..... نہیں نہیں خدا نہ کرے..... میرے منہ میں خاک۔ خدا وہ وقت کبھی نہ لائے..... میں نے شکار کرنا چھوڑ دیا ہے..... میری شان میری آن بان سب ختم ہو کر رہ گئی ہے..... میں تمھیں

کیا بتاؤں میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا..... یہی میری اداسی کا سبب ہے۔'' شاہین نے اپنی داستانِ غم سنائی تو کرگس بھی افسردہ ہوگیا۔ کچھ لمحے خاموشی سے گزرے، پھر کرگس شاہین کو دلاسا دیتے ہوئے بولا۔

''سنو! یہ واقعی بہت افسوس ناک خبر ہے۔ اگر قومی نشان بدل گیا تو کیا ہوا شاہین تو نہیں بدلے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی بھی کڑے وقت میں وہ پھر سے تمھاری صورت اپنالیں گے۔ تمھیں اس وطن کے مستقبل سے، اس کے نونہال شاہینوں سے اور اپنے اللہ سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔''

''نہیں ..... یہاں حالات بہت بگڑ چکے ہیں ..... اگر شاہین زندہ ہوتے تو وہ کسی کو یہ قدم اٹھانے دیتے؟ میں نے سب کچھ دیکھا ہے ..... سب کچھ ..... بہت بگڑے ہوئے حالات ..... بہت ہی بگڑے ہوئے .....''

شاہین کی مایوسی اب بڑھتی جا رہی تھی۔ اپنے پیارے دوست کو غم زدہ دیکھ کر کرگس بولا۔

''پہلے تو سونے اور کھانے کے علاوہ میرا کوئی کام نہیں تھا۔ لیکن اب میں تمھیں مایوسی سے نکالنے کے لیے اقبال کے شاہینوں کو تلاش کروں گا اور تمھیں آ کر اطلاع دوں گا۔ مجھے یقین ہے وہ زندہ ہیں ..... ان کا ضمیر زندہ ہے ..... وہ مجھے ملیں گے ..... ضرور ملیں گے ..... میں جلد آؤں گا دوست ..... میرا انتظار کرنا ..... میں تمھارے لیے خوش خبری لے کر آؤں گا .....'' اور پھر کرگس نے نامعلوم منزل کی طرف پرواز شروع کر دی۔ دو ہفتے گزر گئے۔ کرگس نہ

آیا۔شاہین اب مایوس ہوتا جارہا تھا لیکن ساتھ ساتھ انتظار کی سخت گھڑیاں بھی کاٹ رہا تھا۔

پولیس، ٹیلی فون، بجلی، عدالت، صنعت و تجارت غرض کوئی شعبہ، کوئی محکمہ کرگس نے نہیں چھوڑا..... ہر جگہ رشوت، جھوٹ، لالچ، سفارش، کرپشن۔اسے کوئی ایک بھی شاہین نہ مل سکا، ایک بھی نہیں۔لیکن اس نے تلاش جاری رکھی۔وہ اڑتا رہا ..... اڑتا رہا..... اڑتا رہا.....

''ہمارا جینا اور مرنا صرف اللہ کے لیے ہے۔اقبال کا شاہین کبھی مایوس نہیں ہوتا، وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے خوش اور راضی رہتا ہے۔ہم سب نے مل کر برائی کے خلاف جدوجہد کرنی ہے۔نیک بننے اور نیکی پھیلانے کا پیغام عام کرنا ہے اور اس مقصد کے لیے اگر ہمیں اپنی جانیں بھی قربان کرنا پڑیں تو ہم اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔'' ایبٹ آباد کے پرفضا علاقے میں ایک اسکول کے وسیع صحن میں سیکڑوں بچے قطاریں بنائے کھڑے تھے اور انھیں میں سے ایک بچہ یہ الفاظ کہہ رہا تھا۔یہ صبح کا وقت تھا۔پورے علاقے میں ہُو کا عالم تھا۔لوگ نیند کی میٹھی وادیوں میں گم تھے لیکن اسی اسکول کے وسیع صحن میں وہ سارے بچے چاق و چوبند کھڑے تھے۔ یہ سب ابھی کچھ دیر پہلے نماز سے فارغ ہوئے تھے۔جس کے بعد انھوں نے تلاوت کی اور اب یہ سب اسمبلی کے لیے کھڑے تھے۔تلاوت، نعت اور اچھی بات سنائی گئی۔تب بٹالین کمانڈر نے بلند آواز سے کہا۔''نعرۂ تکبیر۔'' اور پھر ''اللہ اکبر'' کی آواز سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔اور پھر جیش مارچ پاسٹ کے لیے نامعلوم منزلوں کی طرف روانہ ہوگئے۔یہ بچوں کی ایک تنظیم کے سالانہ کیمپ کے مناظر تھے۔

کرگس حیرت و خوشی کے سمندر میں غوطہ زن ہوگیا۔ وہ اپنے دوست شاہین کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا تھا اور اب وہ اسے خوش خبری سنانے جا رہا تھا۔ شاہینوں کو پا لینے کی خوش خبری.....

ہومیر! کام غریبوں کی حمایت کرنا

وہ بڑی بے چینی سے اپنے شان دار بنگلے کے خوب صورت لان میں ٹہل رہا تھا رنگ برنگے پھولوں، خوبصورت کلیوں اور چھوٹی بڑی اُڑتی بیٹھتی تتلیوں کی آنکھ مچولی سے بے خبر وہ کسی اور دنیا میں مگن تھا..... اس کے چہرے سے انتظار کی بے چینی کے علاوہ خوشی کا تاثر بھی عیاں تھا۔

''ڈیڈی نے تو آج آنے میں بڑی دیر لگا دی۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور لان میں رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

عدیل کی عمر پندرہ برس تھی اور وہ نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اسے شاعرِ مشرق حضرت علامہ محمد اقبالؒ سے عقیدت کی حد تک محبت تھی۔ بچوں کے لیے لکھی گئی شاعرِ مشرق کی ساری نظمیں اسے زبانی یاد تھیں..... شاعرِ مشرق کی بے شمار تصاویر اس کے البم کی زینت بن چکی تھیں۔ وہ اکثر سوچا کرتا کہ اگر شاعرِ مشرق زندہ ہوتے تو وہ ان کے ساتھ ضرور ایک تصویر کھنچواتا۔ اپنی اس خواہش کا اظہار وہ اپنے ڈیڈی سے بھی کر چکا تھا اور غالباً اسی خواہش کا نتیجہ تھا کہ اس کے ڈیڈی نے ایک مصوّر کو شاعرِ مشرق کی تصویر کے ساتھ اپنے بیٹے عدیل کی تصویر بنوانے کا آرڈر دے رکھا تھا۔ عدیل نے اپنی سب سے پیاری تصویر مصوّر کو بھجوائی تھی۔

☆☆☆☆

عدیل نے آخری مرتبہ اپنی گھڑی پر نظر دوڑائی اور اندر جانے لگا۔ اسی لمحے رضا

صاحب کی سفید چمکتی ہوئی کار گیٹ سے اندر آئی اور رضا صاحب گاڑی سے باہر نکلے۔

''السلام علیکم ڈیڈی!'' عدیل اپنے ڈیڈی کو جواب کی مہلت دیے بغیر پھر گویا ہوا۔ ''ڈیڈی! یہ آپ کے ہاتھ میں .....''

''جی بیٹا! وہی تصویر ہے جس کے تم منتظر تھے ..... لو کھول کر دیکھ لو۔'' رضا صاحب نے کاغذ میں لپٹی ہوئی تصویر عدیل کے حوالے کرتے ہوئے جواب دیا۔

''واہ ڈیڈی ..... واہ! بڑی پیاری پینٹنگ ہے ..... کتنے اچھے اور خوب صورت رنگوں کا ملاپ کیا گیا ہے ان دو اشعار نے تو گویا تصویر کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ، ضعیفوں سے محبت کرنا
میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو !
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو !

عدیل نے اپنی پسندیدہ شخصیت کے اشعار بلند آواز سے پڑھے اور خاموش ہو گیا لیکن اس کی نظریں بہ دستور تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔

''اور ہاں ..... تمھاری خواہش تھی کہ ٹیوٹر تمھیں پڑھانے آیا کرے ..... تو لو آج تمھاری یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔ یہ شفیق صاحب ہیں کل سے تمھیں پڑھانے آیا کریں گے۔ ٹھیک!'' رضا صاحب عدیل کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولے۔

''او کے ڈیڈی ..... اینڈ تھینک یو ..... اب میں اس تصویر کے لیے کسی مناسب

جگہ کا انتخاب کروں ۔ عدیل نے نظر بھر کر شفیق صاحب کی طرف دیکھا اور کمرے کی طرف چلا گیا۔

''بڑی مہربانی آپ کی سیٹھ صاحب ۔کل سے میں مقررہ وقت پر بچے کو پڑھانے آجایا کروں گا۔اچھا جی خدا حافظ۔'' شفیق صاحب یہ کہہ کر رخصت ہو گئے اور رضا صاحب زیرِلب ''خدا حافظ'' کہہ کر بیڈروم کی طرف بڑھے۔

''کون تھے یہ شخص؟'' عدیل کی امی نے بستر ٹھیک کرتے ہوئے رضا صاحب سے پوچھا۔

''یہاں قریب ہی ایک اسکول میں پڑھاتے ہیں ..... بے چارے کے گھریلو مسائل اتنے زیادہ ہیں کہ تنخواہ سے گزارا نہیں ہو رہا تھا..... اس لیے کسی دوسرے کام کی تلاش میں میرے پاس فیکٹری میں آئے تھے..... عدیل کو ٹیوٹر کی ضرورت تھی سو وہ بھی پوری ہوگئی اور شفیق صاحب کا بھی بھلا ہوا۔'' رضا صاحب نے جوتے اتارتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆☆

شفیق صاحب باقاعدگی کے ساتھ عدیل کو پڑھانے آتے تھے۔ وہ صرف نام ہی کے نہیں حقیقتاً بھی شفیق انسان تھے۔ وہ نہایت محنتی، کھرے اور اپنے اصولوں پر پوری طرح کاربند رہنے والے فرد تھے۔ عدیل تو سیر و تفریح اور کھیل کود سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ سارا وقت پڑھائی میں جو صرف ہوتا۔

اسے تو پہلے ہی شفیق صاحب جیسے مفلوک الحال اور غریب انسانوں سے خدا

واسطے کا بیر تھا۔ اور جب سے شفیق صاحب نے اسے پڑھانا شروع کیا تھا اِس آگ کو اور بھی ہوا ملی تھی ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں شفیق صاحب کے لیے نفرت کے جذبے کو تقویت ملتی رہی لیکن وہ ڈیڈی کے ڈر سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے ڈیڈی شفیق صاحب کو ان کی دیانت اور ایمان داری کی وجہ سے کتنا پسند کرتے ہیں ..... شفیق صاحب اسے پڑھاتے رہے اور اس کے دل میں شفیق صاحب کے لیے نفرت کا جذبہ پروان چڑھتا رہا۔

☆☆☆☆

شفیق صاحب کے چھوٹے بیٹے کو سخت بخار اور زکام تھا۔ کھانسی کی بھی شکایت تھی ۔ لیکن شفیق صاحب اسے سیدھا ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی بجائے عدیل کو پڑھانے آ گئے تا کہ اس کی پڑھائی کا حرج نہ ہو ..... وہ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے ۔ عدیل کو پہلی ہی نظر میں شفیق صاحب کا بیٹا اچھا نہیں لگا ۔ دو تین بار جب وہ

کھانسا اور چھینکیں آئیں تو اسے اس کے وجود سے اور بھی گھن آنے لگی۔

جب شفیق صاحب عدیل کو پڑھا چکے تو سیاہی سے بھری ہوئی دوات اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''بیٹا! تم یہ مشق کر لینا میں ذرا منّے کو ڈاکٹر کے ہاں دکھا آؤں..... اس دوران منّے کو ایک زبردست چھینک آئی اور اس کا ہاتھ دوات سے جا لگا۔ ساری سیاہی عدیل کے کپڑوں کو رنگین کر گئی۔

تڑاخ.....تڑاخ.....تڑاخ..... عدیل نے یکے بعد دیگرے کئی تھپڑ اُس معصوم بچے کے گال پر جڑ دیے اور اٹھ کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ جب کہ شفیق صاحب حیرانی کے عالم میں بچے کے گال سہلاتے رہ گئے۔

☆☆☆☆

عدیل نے جیسے ہی اپنے کمرے کے اندر قدم رکھا اس کی نظر شاعرِ مشرق کی تصویر پر پڑی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اُسے شاعرِ مشرق کا چہرہ بالکل تبدیل لگا۔ ان کے چہرے پر اداسی اور درد کی لہریں تھیں، جیسے انھیں کوئی بڑا صدمہ پہنچا ہو۔

''یہاں آؤ میرے قریب.....'' شاعرِ مشرق کی بارعب آواز سنائی دی۔

عدیل حیرت کا مجسمہ بنے تصویر کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا۔

''مجھے پتا ہے تم مجھ سے پیار کرتے ہو.....اور اسی لیے تو تم نے میری تصویر کے ساتھ اپنی تصویر بھی بنوائی ہے۔ لیکن اب مجھے تم پر افسوس ہو رہا ہے۔ جب تم میری تعلیمات کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالتے ہو تو میرا وجود ٹوٹ پھوٹ کر بکھرنے لگتا ہے۔''

''مم.....مم..... میں سمجھا نہیں۔'' عدیل کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کی معصومیت پر شاعرِ مشرق کے چہرے پر لطیف مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''تم اس تصویر کو غور سے دیکھو جس طرف تمھاری تصویر بنی ہوئی ہے۔ اُس کونے پر کیا لکھا ہے؟''

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا　　درد مندوں سے، ضعیفوں سے محبت کرنا
میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو !　　نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو !

عدیل جوں جوں اشعار پڑھتا گیا توں توں اُس کے چہرے پر ندامت اور شرمندگی کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔ اُس کے اندر کا انسان پوری طرح جاگ اٹھا تھا۔

شاعرِ مشرق گویا ہوئے۔

''عدیل میاں! جب میں تمھیں چھوٹی چھوٹی غلطیاں اور کوتاہیاں کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی اذیت ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں چلو کوئی بات نہیں۔ چوں کہ تم میری شاعری سے محبت کرتے ہو، میری تعلیمات سمجھو گے تو خود ہی نیک بن جاؤ گے۔ لیکن آج تو تم نے حد ہی کر دی۔ ایک معصوم بچے کے گال پر تھپڑ رسید کر دیے۔ کتنا دل دُکھایا ہے تم نے اس بچے کا۔ کیا یہی میری تعلیمات ہیں؟ کیا یہی نتیجہ ہے مجھ سے اور میری شاعری سے محبت کرنے کا؟ یہ تو قول و عمل کا کھلا تضاد ہے۔ میرا پیغام، میری شاعری صرف پسند کرنے کے لیے تو نہیں بلکہ عمل کرنے کے لیے بھی ہے۔'' عدیل محسوس کر رہا تھا کہ یہ کہتے ہوئے شاعرِ مشرق کی آنکھیں چھلک پڑیں ہیں۔

''آئی ایم ویری سوری۔ مجھے معاف کر دیجیے..... میں ضرور آپ کی تعلیمات کو مشعلِ راہ بناؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

پہاڑ اور گلہری

بھولی بھالی معصوم سی گلہری اچھلتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ اس کے منہ میں ایک چھالیا تھی۔ اونچے بڑے پہاڑ نے اسے دیکھا تو ہنس پڑا۔ ننھی منّی گلہری کا مذاق اڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اے چھوٹی سی گلہری! تجھے اپنے چھوٹے سے قد پر شرم نہیں آتی۔ تو اتنی چھوٹی سی تو ہے لیکن کتنی مغرور لگتی ہے۔ واہ واہ! تجھے اپنی سمجھ اور عقل پر کتنا ناز ہے۔ تیرے جیسے بے حیثیت اگر اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگیں تو اس پر خدا کی شان یاد آتی ہے۔ تو کس قدر کم عقل ہے لیکن ہے کتنا گھمنڈ۔ اپنے مقابلے میں مجھے دیکھ! میری شان اور قد کاٹھ کے سامنے زمین کی لمبائی چوڑائی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر میرے آگے تیری کیا بساط ہوسکتی ہے۔ مجھے جو مقام حاصل ہے وہ تجھے کیسے نصیب ہوسکتا ہے۔ تیرا میرا مقابلہ ہی کیا۔ کہاں ایک غریب ننھا سا جانور اور کہاں اتنا بڑا اونچا پہاڑ .....''

بے چاری گلہری نے پہاڑ کی یہ ڈینگیں بھری باتیں سنیں تو اس کا دل بہت دُکھا۔ کہنے لگی: ''اونچے لمبے پہاڑ! ہوش میں آؤ! ایسی چھوٹی باتیں تمھیں زیب نہیں دیتیں۔ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھو۔ غرور اچھی بات نہیں ہوتی۔ ذرا سوچو! تم اتنے بڑے ہو تو اس میں کیا بڑائی ہے۔ اگر میں تمھاری جیسی اونچی لمبی نہیں تو تم بھی تو میری طرح ننھے منّے اور نرم و نازک نہیں ہو۔ ذرا غور کرو تو پتا چلے کہ خدا تعالیٰ نے ہر چیز میں کوئی نہ کوئی مصلحت رکھی ہے۔ اس نے کسی کو بڑا بنایا ہے، کسی کو چھوٹا، اس کی کاری گری یہی ہے۔ اُس نے تمھیں اتنا اونچا اور لمبا بنا دیا اور مجھے اتنا چھوٹا ہونے پر بھی یہ طاقت بخشی کہ میں

اونچے اونچے درختوں پر چڑھ سکتی ہوں۔ تم اتنے بڑے ہو لیکن
اپنی جگہ سے ایک قدم بھی نہیں ہل سکتے۔ تم کتنے مجبور ہو، اگر تمھیں اپنے
اوپر اتنا ہی ناز ہے اور تم خود میں کوئی بڑائی پاتے ہو تو میری طرح
کوئی ہنر دکھاؤ۔ یہ چھالیا جو میرے مُنھ میں ہے ذرا اسے ہی توڑ
دو۔ اگر تم اتنے بڑے ہو کر بھی اتنا چھوٹا سا کام نہیں کر سکتے تو پھر
اپنے بڑے ہونے پر اس غرور کی کیا ضرورت ہے۔ یاد رکھو! خدا
کی پیدا کی ہوئی اس دنیا میں نہ تو کوئی چیز بے کار ہے اور نہ ہی
کوئی بُرا ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ اس لیے کہ خدا نے
انھیں کسی نہ کسی مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ سب اپنی ڈیوٹی
دے رہے ہیں اور اپنے اپنے کام میں مگن ہیں۔

ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا، کوئی چھوٹا، یہ اس کی حکمت ہے

خُدا بخش اور خودی

خدا بخش کا گھر غریبوں کی ایک ایسی بستی میں تھا جو حکومت کی جگہ پر بنالی گئی تھی۔ بہت سے بے گھر افراد نے اس خالی پلاٹ پر مکان بنا لیے تھے۔ اِس بات کو کوئی بیس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ سب لوگ محنت مزدوری کرتے تھے۔ خدا بخش میٹرک پاس تھا اور ایک پرائیوٹ کمپنی میں کلرک تھا۔ اُس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹا چھٹی اور بیٹی پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ایک بوڑھی ماں اور بوڑھا باپ بھی خدا بخش کے مختصر سے گھر میں باعثِ برکت و سعادت تھے۔ خدا بخش کی تنخواہ معمولی تھی۔ بڑی مشکل سے گزارا ہوتا۔ بچوں کی تعلیم کے اخراجات زیادہ پریشانی کا باعث تھے۔ خدا بخش پانچ وقت کا نمازی اور صبر شکر کرنے والا انسان تھا۔

ایک دن کیا ہوا کہ چند سرکاری ملازم ہاتھوں میں فائلیں پکڑے ہوئے آئے اور بستی کی پیمائش کرنے لگے۔ پھر انھوں نے رات کے وقت بستی کے تمام لوگوں کو جمع کیا اور کہنے لگے:

''حکومت یہ زمین خالی کرانا چاہتی ہے۔ ہم آپ لوگوں کو بے گھر بھی نہیں کریں گے۔ اس لیے حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ لوگوں کو متبادل جگہ پر مکان دے دیے جائیں۔ دو دو کمروں کے یہ کوارٹر یہاں سے ۵ کلومیٹر کے فاصلے پر عزت کالونی میں موجود ہیں۔ ایک کوارٹر کی قیمت دو لاکھ روپے ہے، لیکن حکومت آپ کو یہ رعایت دے

رہی ہے کہ آپ صرف ۵۰ ہزار روپے دے کر عزت کالونی میں کوارٹر حاصل کر سکتے ہیں اور اس کے لیے آپ لوگوں کے پاس تین مہینے کی مہلت ہے۔''

''لیکن اتنے روپے ہم کہاں سے دیں گے؟'' مجمعے میں سے کئی آوازیں ایک ساتھ گونجیں۔

''ہم تو یہیں رہیں گے۔ یہ تو سراسر ظلم ہے۔'' ایک آدمی بولا۔

''الیکشن پر تو ہم سے یہ وعدے کیے گئے تھے کہ یہ جگہ غریبوں کے نام الاٹ

کر دی جائے گی۔ اس لیے اس جگہ پر اب ہمارا حق ہے۔ ہم یہاں بیس سال سے رہ رہے ہیں۔'' ایک اور آدمی نے کہا۔

'' دیکھیں آپ جذباتی نہ ہوں۔ آپ کی پوزیشن دیکھتے ہوئے ہی آپ کو دو لاکھ کا کوارٹر ۵۰ ہزار روپے میں دیا جا رہا ہے۔ ورنہ حکومت آپ کو متبادل مکان دیے بغیر بھی نکال سکتی تھی۔'' ایک سرکاری کارندے نے کہا۔

سرکاری ملازموں نے بستی کے گھروں کی تفصیل اور ان کے سربراہوں کے نام نوٹ کر لیے اور انھیں تحریری نوٹس جاری کر دیے۔ خدا بخش نوٹس لے کر گھر آ گیا۔ سب ہی پریشان تھے۔ چند دن اور گزر گئے۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو خدا بخش نے صدرِ مملکت اور گورنر کے نام اپیلیں بہ ذریعہ فیکس روانہ کر دیں۔

ایک رات خدا بخش کا بیٹا غلام مصطفیٰ اپنی درسی کتاب سے علامہ اقبالؒ کا شعر پڑھ رہا تھا۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

'' ابو! خودی کا کیا مطلب ہے اور اسے بلند کرنے سے کیا مطلب ہے؟'' غلام مصطفیٰ نے پوچھا۔

'' بیٹا! خودی کا مطلب ہے اپنے آپ کو پہچاننا۔ ہم مسلمان ہیں اور ہماری ایک الگ شناخت ہے۔ ہماری گفتگو، ہمارا رہن سہن، ہمارا کھانا پینا اور ہمارا ہر فعل غیر مسلموں سے الگ ہے۔ اگر ہم لوگ کافروں جیسے کام کرنے لگ جائیں تو سمجھو ہماری خودی ختم

ہوگئی۔ خودی کو بلند کرنے سے مراد اپنی الگ شناخت کو مضبوطی سے قائم رکھنا ہے۔ جو لوگ اپنے ہر کام میں یہ بات یاد رکھتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور انھیں صرف وہی کام کرنے چاہییں جن کے کرنے کا اسلام نے حکم دیا ہے اور ان کاموں سے باز رہنا چاہیے جن سے منع کیا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ اُن سے اتنا خوش ہوتا ہے کہ ان کی مرضی کے مطابق ان کے سارے مسئلے حل کر دیتا ہے۔'' خدا بخش نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

بستی کا معاملہ جوں کا توں برقرار تھا۔ چند دن اور گزر گئے۔ خدا بخش کے پاس رقم کا کوئی بندوبست نہ ہوسکا۔ ایک روز خدا بخش دفتر سے واپس آیا تو اس کی بیوی بڑی خوش بیٹھی تھی۔ اُس نے کہا۔

''میں آج ساتھ والے محلے میں گئی تھی۔ وہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے شبراتن۔ میں نے اُس سے بات کی ہے۔ اُس کا شوہر سہ پہر ۳ بجے کہیں کام پر جاتا ہے اور رات ۹ بجے واپس آتا ہے اور ایک ہزار روپے روزانہ کما کر لاتا ہے۔ شبراتن کہہ رہی تھی کہ وہ آپ کو اپنے شوہر کے ساتھ بھیج دے گی۔ اس طرح آپ دفتر سے آکر پارٹ ٹائم ملازمت سے ایک ہزار کی دہاڑی کمائیں گے تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ۳ سے ۹ بجے تک ۶ گھنٹے میں ایک ہزار روپے کیسے کمائے جاسکتے ہیں؟'' خدا بخش نے حیرت سے کہا۔

''شبراتن کوئی مذاق تھوڑا ہی کر رہی تھی۔ آپ اُس کے شوہر سے مل کر تو دیکھیں۔'' بیوی نے اصرار کیا۔

''ہرگز نہیں! وہ یقیناً کوئی غیر قانونی کام کرتا ہوگا۔ میں ایسے کسی کام میں حصہ نہیں لوں گا۔'' خدا بخش نے دوٹوک کہا۔ اُس کی بیوی نے منہ بنا کر کہا۔

''کیا اس سے آپ کی خودی متاثر ہوتی ہے؟''

''بالکل ٹھیک کہا بیگم!'' خدا بخش نے مختصر جواب دیا۔

دو دن بعد خدا بخش اخبار لے کر گھر میں داخل ہوا اور ایک خبر اپنی بیوی کو

دکھاتے ہوئے بولا! بیگم دیکھنا کہیں یہ شخص ہی تو تمھاری سہیلی شبراتن کا شوہر نہیں ہے۔''

بیوی نے دیکھا تو اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''ہاں ..... ہاں یہ تو وہی ہے!''

''دیکھا! اللہ تعالیٰ نے ہمیں بچالیا۔ پولیس نے اس شخص کو منشیات فروخت کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا ہے۔'' خدا بخش بولا۔

آخر کرتے کرتے خدا بخش کے سوا بستی کے تمام لوگ مکان خالی کر کے نئی کالونی میں شفٹ ہو گئے۔ شاید خدا بخش ہی سب سے غریب تھا۔ اُس کے پاس صرف ایک ہفتے کی مہلت رہ گئی تھی۔ اس کا مکان بستی کے ایک کونے پر تھا۔ باقی مکانوں پر ٹھیکیدار نے بلڈوزر پھروا کر دفتروں کی تعمیر کے لیے بنیادیں کھودنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ خدا بخش کے گھر میں سخت پریشانی کا عالم تھا۔ ایک شام وہ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر ایک واقف کار شادو بھائی کے پاس گیا اور اُسے ساری صورتِ حال کہہ سنائی۔ شادو بھائی نے کہا۔ ''بھائی خدا بخش بات یہ ہے کہ ۵۰ ہزار روپے تو میں اسی وقت دے سکتا ہوں لیکن مجھے ان پیسوں کی دو ماہ بعد سخت ضرورت پڑے گی۔ اگر تم دو مہینے بعد واپس کرنے کا وعدہ کرو تو رقم لے لو۔''

''نہیں بھئی، میں دو مہینے میں تو واپس نہیں کر سکتا۔ میں جھوٹا وعدہ کر کے تو رقم نہیں لوں گا۔'' خدا بخش نے فوراً کہا۔

''پھر تو مجھے افسوس ہے۔ کسی اور سے بات کر کے دیکھو۔ ہاں یاد آیا کیوں نہ سردار کاکا سے بات کی جائے۔ وہ لوگوں کو قرض دیتا ہے اور رقم قسطوں میں واپس لیتا

ہے۔'' شادو بھائی نے کہا۔

''اچھا، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ چلو سردار کاکا سے بات کر آئیں۔'' خدا بخش نے کہا۔

خدا بخش، اُس کا بیٹا اور شادو بھائی سردار کاکا کے پاس گئے۔ وہ اپنی بیٹھک میں قالین پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ شادو بھائی نے اسے تفصیل بتائی تو اس نے خدا بخش سے کہا۔ ''جتنی چاہے رقم لے لو۔ ۵۰ ہزار روپے میں تمھیں دے دیتا ہوں۔ لیکن ایک ہزار روپے ماہانہ قسط ادا کرنا ہوگی اور یہ قسطیں تم ۶ سال تک ادا کرو گے یعنی منافع کے ساتھ ۷۲ ہزار روپے واپس کرو گے۔ تم اسٹامپ پیپر پر مجھے لکھ کر دو گے کہ تم نے مجھ سے ۷۲ ہزار روپے ادھار لیے ہیں جو ہر ماہ ایک ہزار کی قسط میں واپس کرو گے۔'' خدا بخش نے کہا۔

''ایک ہزار کی قسط تو مجھے منظور ہے اور ۶ سال کی بھی کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ تو سراسر سود ہے اور سود کا لین دین تو یہودیوں کا طریقہ ہے۔ مسلمان تو ایسا کام نہیں کرتے۔''

سردار کاکا نے چلّا کر کہا۔ ''چلو پھر بھاگو یہاں سے بڑے آئے مومن۔''

شادو بھائی نے خدا بخش کو سمجھایا مگر وہ اٹھ کر باہر آ گیا۔ واپس آتے ہوئے غلام مصطفیٰ نے کہا۔ ''ابو! آپ نے دو موقعے کھو دیے۔ اگر آپ شادو بھائی سے وعدہ کر کے رقم لے لیتے تو کیا حرج تھا یا پھر سردار کاکا سے قسطوں پر رقم لے لیتے۔''

''خاموش..... تم پر میری تربیت کا یہ اثر ہوا ہے؟'' خدا بخش نے اپنے بیٹے کو

ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''ابھی چند دن پہلے ہی تو تم مجھ سے خودی کو بلند کرنے کا مطلب پوچھ رہے تھے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں جھوٹ بول کر اور شادو بھائی کو دھوکا دے کر اپنی غیرت اور خودی کو ختم کردوں یا سود پر رقم لے کر غیر مسلموں کا طریقہ اختیار کرلوں؟''

''معاف کردیں ابو! آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ ہم کوئی غلط کام نہیں کریں گے بلکہ پوری ہمت سے ہر مشکل کو برداشت کریں گے۔'' غلام مصطفیٰ بولا۔

اب صرف دو دن باقی تھے۔ انھیں ایک بار پھر نوٹس مل چکا تھا کہ وہ جگہ چھوڑ دیں۔ خدا بخش نے اپنے گھر والوں سے کہا۔

''دیکھو، یہ جگہ حکومت کی ملکیت ہے۔ اب حکومت کو اس کی ضرورت ہے ہم یہاں زبردستی تو نہیں رہ سکتے۔ میں نے ایک وکیل سے مشورہ کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ عدالت سے رجوع کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عدالت آپ کے حق میں فیصلہ دے دے۔''

آخری دن ٹھیکیدار نے انھیں آ کر کہا کہ وہ جلد از جلد اپنا سامان نکال لیں۔ خدا بخش نے ایک واقف کار سے منت سماجت کی اور اس نے انھیں ایک کمرہ عارضی طور پر دے دیا۔ گھر کا ٹوٹا پھوٹا سامان انھوں نے اس کے گھر لے جانے کے لیے باہر نکالا ہی تھا کہ ایک سائیکل آ کر رکی۔ اس پر سے خدا بخش کے وکیل کا منشی اترا۔ اس نے کہا۔

''مبارک ہو خدا بخش۔ عدالت نے 'اِسٹے آرڈر' جاری کردیا ہے۔ اب فیصلہ ہونے تک اس مکان کو کوئی نہیں گرا سکتا۔ آپ سامان اندر واپس لے جائیں۔''

ٹھیکیدار بھی آ موجود ہوا۔ اس نے کہا۔

''اسٹے آرڈر تو پہلی پیشی پر ہی خارج ہو جائے گا۔ حکومت کے خلاف کیس لڑنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔''

''چلو جب خارج ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال آپ اپنا سامان اندر رکھیں۔'' منشی نے کہا۔

غلام مصطفیٰ نے اپنے والد کے کان میں سرگوشی کی۔

''ٹھیکیدار ٹھیک کہتا ہے۔ اسٹے آرڈر عارضی ہے۔ بالآخر چند دن میں حکومت اپنی یہ جگہ خالی کرا لے گی۔ اگر بستی کے تمام لوگ مل کر احتجاج کرتے تو کوئی بات بھی تھی۔ آپ تو بالکل اکیلے رہ گئے ہیں۔''

اگلے روز ایک شخص خدا بخش کے دفتر آیا اور بولا۔

''آپ میرے ساتھ چلیں، آپ کو ضلع ناظم صاحب نے بلایا ہے۔''

''وہ کس لیے؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔'' اس آدمی نے کہا۔

خدا بخش ضلع ناظم سے ملا تو انھوں نے کہا۔

''عدالت نے تو فیصلہ ہمارے حق میں ہی دینا تھا اللہ تعالیٰ نے آپ کی سن لی ہے۔ آپ کی درخواست پر گورنر صاحب نے مجھے ہدایت کی ہے کہ بیس سال سے آباد لوگوں کو بستی سے بے دخل نہ کیا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ باقی لوگ تو اپنی رضامندی سے نئی کالونی میں جا چکے ہیں۔ صرف آپ رہ گئے ہیں۔ آپ کے مکان کا

میں سسٹم سروے کروایا ہے۔ وہ بالکل ایک طرف ہے۔ ہمارے دفاتر باقی جگہ پر آسانی سے بن سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو وہیں رہیں۔ ہم آپ کے نام وہ جگہ الاٹ کر دیں گے اور اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو عزت کالونی میں مفت کوارٹر دے دیں گے۔''

خدا بخش نے کہا کہ وہ اپنے گھر والوں سے مشورہ کر کے بتائے گا۔ گھر آ کر پہلے اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر ادا کیا اور پھر گھر والوں سے مشورہ کرتے ہوئے بولا۔

''اللہ تعالیٰ نے اب ہماری مرضی پر فیصلہ چھوڑ دیا ہے۔ اب بتاؤ کیا مناسب رہے گا؟''

سب نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ چند روز بعد خدا بخش اپنے والدین اور بیوی بچوں کو لے کر عزت کالونی میں باعزت طور پر شفٹ ہو گیا۔ غلام مصطفیٰ نے نئے گھر کے دروازے پر چاک سے لکھ دیا:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے!

''معافی چاہتا ہوں ..... ہم کلامِ اقبال کی مزید ریکارڈنگ نہیں کر سکتے۔''

''لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ ۹ نومبر کے حوالے سے خاص پروگرام تیار کیا جائے گا۔''

پروگرام پروڈیوسر کا جواب سنتے ہی رفیق خان نے چونک کر کہا۔

''مجھے یاد ہے ..... دراصل مجھے اپنے پروجیکٹ کی منظوری نہیں مل سکی۔'' وہ شرمندگی سے بولا۔

''مگر کیوں .....؟''

''جانتا ہوں آپ کو میرا انکار بُرا لگا لیکن کیا کر سکتا ہوں میں تو صرف کٹھ پتلی ہوں۔ منظوری دینا یا نہ دینا تو اوپر والوں کا کام ہے ..... آپ بہت بڑے فنکار ہیں اور میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا یوں روز روز چکر لگانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس لیے آج سچ بولنا پڑا۔''

''پلیز ..... میں صرف اصل وجہ جاننا چاہتا ہوں۔'' رفیق خان نے بے چینی سے اس کی بات کاٹی۔

''حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اعلیٰ افسران کا کہنا ہے کہ لوگوں میں نہ تو اب اتنا

ذوق ہے اور نہ ہی شعور کہ کلامِ اقبال کی گہرائیوں کو سمجھ سکیں۔ اوپر سے ریکارڈنگ کے اخراجات آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ چناں چہ بجٹ کنٹرول کرنے کے لیے اس مرتبہ پرانے پروگرام چلا کر وقت گزارنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔'' پروڈیوسر نے نظریں چراتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''اور آپ کا کیا خیال ہے اس سلسلے میں .....؟'' رفیق خان نے اس کی ذاتی رائے جاننے کی کوشش کی۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس پابندی سے خوش نہیں۔ لیکن اگر غیر جانب داری سے موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے، فیصلہ اتنا برا بھی نہیں۔ یقین کریں ..... ریڈیو پاکستان کے فرمائشی پروگراموں میں ایسے افراد کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی ہوگی جو کلامِ اقبال سننا چاہتے ہیں۔ رہی سہی کسر ڈش کیبل نے نکال دی ہے۔ خود سوچیں ان حالات میں اگر ہم سامعین کی پسند کا خیال نہیں رکھیں گے تو کام کیسے چلے گا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔''

اس سے قبل کہ رفیق خان کوئی جواب دیتا میز پر پڑے فون کی گھنٹی نے اپنے وجود کا احساس دلایا اور پروڈیوسر ریسیور اٹھا کر کسی نئے فلمی پروگرام کی خصوصیات گنوانے لگا ..... بات جب زیادہ لمبی ہوئی تو رفیق خان نے محسوس کیا کہ پروڈیوسر اس کے جانے کا انتظار کر رہا ہے، چناں چہ مزید احمق بننے کی بجائے وہ خاموشی سے اٹھا اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے دفتر سے باہر آ گیا۔

دوسرے روز رفیق خان اپنے دوست مشہور مصور قاسم مرزا سے ملنے اس کے

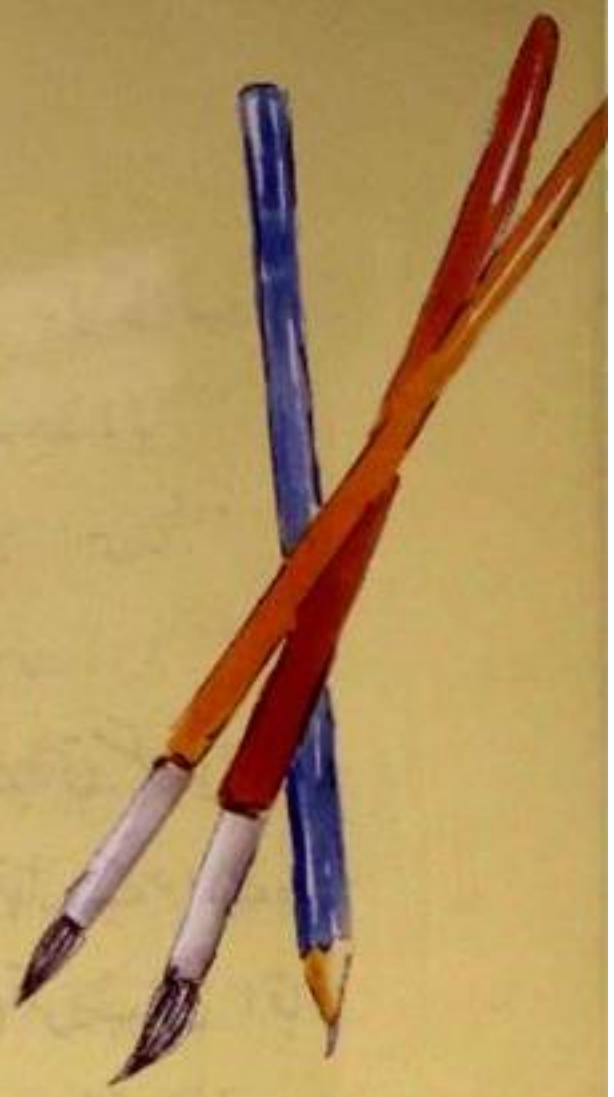

اسٹوڈیو پہنچا تو وہ بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

''کہاں تھے تم ..... کب سے راہ دیکھ رہا ہوں۔''

''خیریت تو ہے۔'' رفیق خان نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں بابا خیریت ہے۔ میں تو صرف تمھاری ریکارڈنگ کی کہانی سننے کے لیے بے چین تھا۔'' قاسم مرزا مسکراتے ہوئے بولا۔

''تو سن لو ..... اب ریکارڈنگ نہیں ہو سکے گی۔''

''کیا مطلب ..... میں سمجھا نہیں۔''

''ریڈیو حکام کا کہنا ہے کہ لوگ صرف ہلکے پھلکے تفریحی پروگرام سننا چاہتے ہیں۔ انھیں کلامِ اقبال کی سمجھ نہیں آتی۔'' رفیق خان نے مختصر روداد سناتے ہوئے کہا۔

''اور تم نے کیا جواب دیا۔'' قاسم مرزا چند لمحے توقف کے بعد بولا۔

''کچھ نہیں ..... میں تو اس قدر غیر متوقع جواب سن کر بولنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔''

''خیر ..... جو ہوا بھول جاؤ۔ اداس ہونے کی ضرورت نہیں ..... ویسے بھی یہ ملک اپنا ہے لوگ اپنے ہیں تو ضروری نہیں کہ ہمیشہ مرضی بھی اپنی چلے۔ میں تمھیں ایک نئی بات سناتا ہوں۔ جانتے ہو آج کیا ہوا۔'' رفیق خان کی بڑھتی ہوئی اداسی دیکھ کر قاسم مرزا نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''میں کیسے بتا سکتا ہوں۔تم بتاؤ گے تو معلوم ہوگا۔'' وہ زبردستی مسکرایا۔

''صبح سویرے چند سرکاری اہلکار مجھ سے ملنے آئے۔انھیں یومِ اقبال کے حوالے سے چند تصاویر کی ضرورت تھی۔ جب میں نے ان سے یہ پوچھا کہ ان کی تقریب میں اقبال کی زندگی کے کس پہلو کو زیرِ بحث لایا جائے گا تو ان میں سے ایک نے کہا۔''جناب آپ موضوع کو چھوڑیں ذرا مشکل اور تجریدی قسم کی تصاویر بنادیں۔ ایسی تصویروں کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو سمجھ بھی نہیں آتیں اور وہ عقل مندی کا بھرم رکھنے کے لیے تفصیل جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔''

''تو لے گئے اپنی من پسند تصویریں؟''

''نہیں ..... میں نے صاف کہہ دیا کہ اقبال کے خیالات کو کینوس پر اتارتا ہوں، لوگوں کی نمائشی تقاریب کو رنگین بنانے کے لیے وال پیپر نہیں بناتا۔کیوں کہ میرا فن میرا مشن ہے، میری ضرورت یا مجبوری نہیں۔اس لیے آپ کوئی دوسرا در تلاش کریں۔''

قاسم مرزا کا جواب سن کر رفیق خان اس قدر جذباتی ہوا کہ بے اختیار اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اُسی لمحے کمرے کا دروازہ ہلکی سی چَرچَراہٹ سے کھلا اور ان کا تیسرا دوست وقار حسن گہری سوچ میں گم کمرے میں داخل ہوا۔اور سلام کر کے ان

کے قریب بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے..... پریشان ہو؟'' رفیق خان نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں..... حیران ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''کس بات پر.....؟'' دونوں نے چونک کر پوچھا۔

''یاد ہے پچھلے برس میں نے نہایت محنت اور تحقیق کے بعد تحریکِ پاکستان کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی جسے حکومت کی جانب سے ایوارڈ بھی ملا تھا۔''

''ہاں بھئی ہم کیسے بھول سکتے ہیں اس کتاب کو..... ہمیں تو یہ بھی یاد ہے کہ اس کتاب کی کل اشاعت کا چوتھائی حصہ بھی فروخت نہیں ہوا تھا۔

''قاسم مرزا نے باقاعدہ سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔' لیکن تم لوگ یہ نہیں جانتے کہ اس کتاب کا نقصان پورا کرنے کے لیے پبلشر نے مجھ سے زبردستی ایک عدد جاسوسی ناول بھی لکھوایا تھا۔ اس کا کہنا تھا ہمارے ملک کے بزرگ اور درمیانی عمر کے شہری اپنے اپنے خاندانوں کی کفالت کے سلسلے میں معاشی اور معاشرتی مسائل سے برسرِ پیکار ہیں۔ باقی رہ گئے نوجوان طالب علم تو ان کے لیے کورس کا مطالعۂ پاکستان ہی مصیبت بنا ہوا ہے۔ جس کا ثبوت مختلف امتحانات کے نتائج میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان حالات میں تحریکِ پاکستان کے بارے میں کون پڑھنا چاہے گا۔ اس لیے کتاب کا نقصان پورا کرنے کے لیے ناول لکھنا ضروری ہے۔''

''کیا تم سچ بول رہے ہو؟'' رفیق بے ساختہ بولا۔

''ہاں..... اور اس سے بھی بڑا سچ یہ کہ وہ ناول چھپ چکا ہے۔''

''کک ..... کیا!'' مارے حیرت کے دونوں کے منہ بہ یک وقت کھلے۔

''آگے تو سنو ..... آج پبلشر کے پاس گیا تو اس نے بڑی خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ناول کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا ہے اور دوسرے کی چھپائی جاری ہے۔''

وقار حسن کی بات سن کر ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور کمرہ ان کے بے ساختہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

''تم لوگ ہنس رہے ہو .....'' وقار حسن نے انہیں گھورا۔

''نہیں تو .....'' دونوں اپنی ہنسی ضبط کرنے لگے۔ اچانک ہنسی ضبط کرنے کے باعث ان کے چہرے ٹماٹر کی مانند سرخ ہو چکے تھے۔ ان کی بے چارگی دیکھ کر وقار حسن ایک لمحے کے لیے ہلکا سا مسکرایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

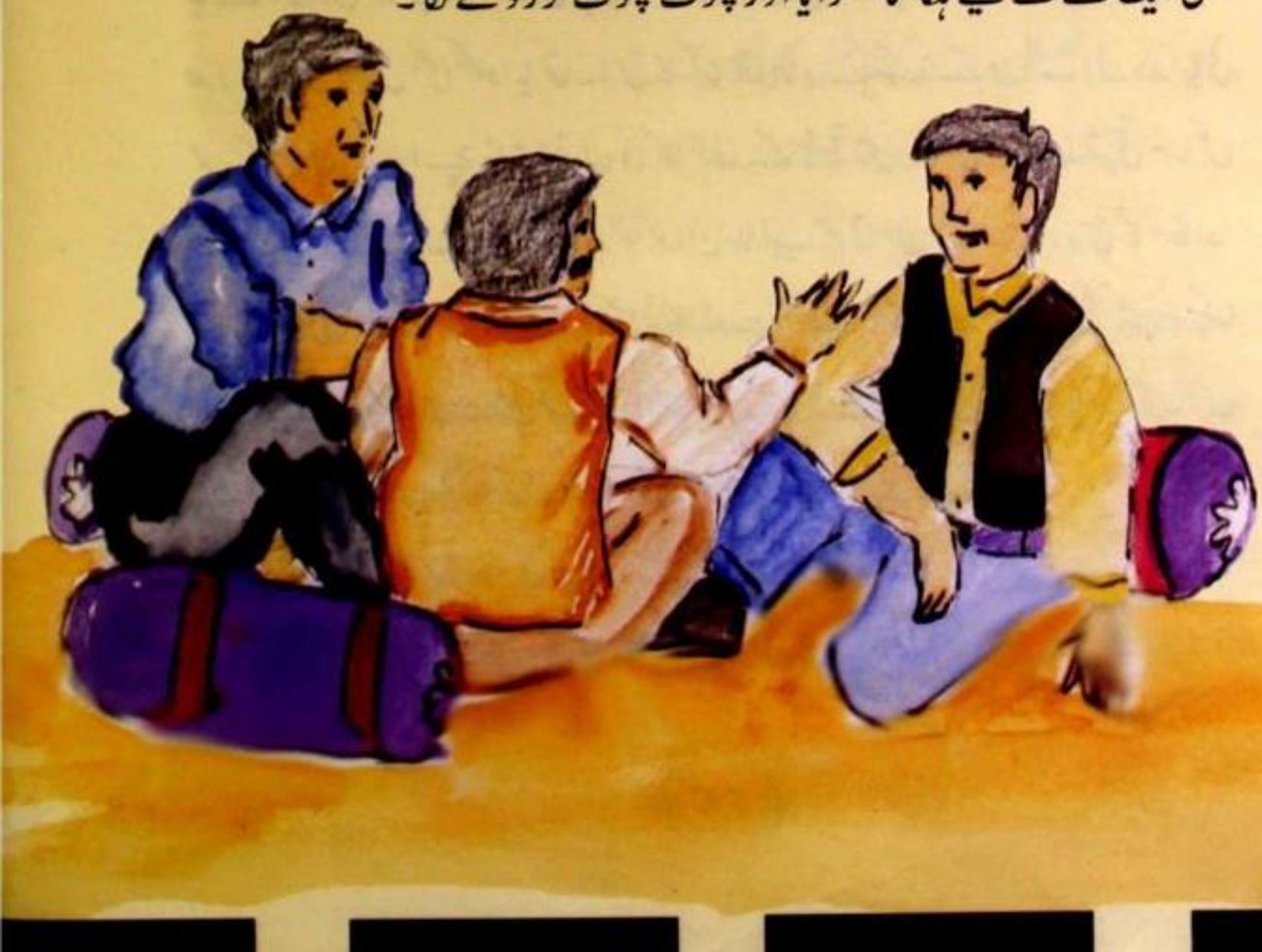

''ارے پاگل .....تم تو سچ مچ رونے لگے ..... ہم تم پر تو نہیں ہنس رہے تھے۔''
رفیق خان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے دلاسا دیا۔

''جانتا ہوں تم مذاق نہیں اڑا رہے لیکن وقت تو ہم پر ہنس رہا ہے نا۔ تم لوگ نہیں جانتے میں نے کتنی محنت سے اپنے پبلشر کو اس کتاب کی اشاعت کے لیے رضا مند کیا تھا۔ وہ شرط لگانے کے لیے تیار تھا کہ آج کل لوگ اس قسم کی کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں، اپنے ڈرائنگ روم کی کلراسکیم کے لیے خریدتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے ہم وطن اس کتاب سے ضرور استفادہ کریں گے ..... آج نہ چاہتے ہوئے بھی میں اقرار کرنے پر مجبور ہوں کہ ہماری نئی نسل کے ذہنوں میں اپنے قومی رہنماؤں کے چہرے دھندلانے لگے ہیں۔ خود سوچو قائد اور اقبال کے علاوہ کتنے ہیں جن کی تصویریں دیکھ کر ہمارے نوجوانوں کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھرتی ہے۔''

''لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟'' قاسم مرزا نے نکتہ اٹھایا۔

''میرا خیال ہے اس سوال کا جواب دینے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں۔ ہر شخص ملبہ دوسرے پر ڈال کر بری الذمہ ہو جانا چاہتا ہے۔ رفیق خان نے جواب دیا۔

''میں رفیق خان سے متفق ہوں اور میرے نزدیک نوبت یہاں تک پہنچنے میں قصور کسی ایک کا نہیں۔ عوام، حکمران، سیاست دان، میڈیا اور کسی حد تک مذہبی علما بھی شامل ہیں جنھوں نے محض ذاتی مفادات کے حصول کے لیے قوم کو ''ایک ہوں مسلم'' کی صف سے نکال کر فرقوں میں بانٹ دیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اپنے رہنماؤں کی سنہری

تصنیفات سے اتنا فائدہ خود ہم نے نہیں اٹھایا جتنا غیر مسلم اقوام نے۔ اس کی ایک واضح مثال اقبال کی شاعری ہے جس کا ترجمہ تقریباً ہر بڑی زبان میں ہو چکا ہے۔''
وقار حسن نے پر جوش انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ جس جذبے سے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا کہ اگر اسی جذبے سے اس کی تعمیر بھی کرتے تو آج اس سوہنی دھرتی کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ ہم تینوں کو پاگل، خبطی اور فلاسفر جیسے القاب سے نوازتے ہیں لیکن مجھے کبھی غصہ نہیں آتا۔ کیوں کہ سچ یہی ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی ترقی، استحکام اور خوش حالی کے لیے ہمیشہ جنونی انداز میں سوچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کچھ بھی کہے ہمیں اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہے اور رہے گا۔''

قاسم مرزا کے ان تاثرات نے محفل کو عجیب سا جذباتی رنگ دے دیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سب کی آنکھوں میں محبت اور وفا کے سچے موتی چمک اٹھے تھے۔ یہ کیفیت جانے کتنی دیر تک برقرار رہتی کہ اچانک دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک سے ان سب کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

''کون .....؟'' قاسم مرزا نے بھیگی پلکیں صاف کرتے ہوئے ہانک لگائی۔

''میں ہوں انکل۔''

''میں کون؟'' قاسم مرزا نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں ..... امید اور میری دوست خوشی ..... کیا ہم اندر آ سکتے ہیں۔''

''آ جائیں ..... دروزاہ کھلا ہے .....'' قاسم نے جواب دیا۔

چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور خوب صورت لباس میں ملبوس دو چاندسی بچیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔

''انکل! میں امید اور یہ خوشی ..... ہم دونوں بہنیں سامنے والے گھر سے آئی ہیں۔'' ان میں سے ایک نے تعارف کروایا۔

''جی بیٹی میں نے پہچان لیا ہے ..... کہیے کیسے آنا ہوا۔'' قاسم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''انکل! ہمارے اسکول میں یومِ اقبال کی تقریب ہے اور ہمیں اس میں حصہ لینا ہے ..... ہماری مس کہتی ہیں تقریر یاد کرو۔ امی کہتی ہیں نظم پڑھنا ..... سب مشورے دے رہے ہیں لیکن کوئی ہماری مدد نہیں کر رہا۔ اس لیے ابو نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔ کیا آپ ہماری مدد کریں گے؟''

''ضرور مدد کریں گے لیکن پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ خود اس تقریب میں کیا کرنا چاہتی ہیں؟'' وقار حسن نے پیار بھرے انداز میں پوچھا۔

''اگر ہم سچ بولیں تو وعدہ کریں مذاق نہیں اڑائیں گے۔'' امید جھجکتے ہوئے بولی۔

''وعدہ رہا.....'' رفیق خان نے پہلی مرتبہ دلچسپی لی۔

''دراصل ہم اس تقریب میں 'اچھا پاکستان' بننا چاہتے ہیں۔'' وہ پرجوش انداز میں بولی۔

''بہت اچھی بات ہے ..... لیکن آپ پاکستان ہی کیوں بننا چاہتی ہیں کچھ اور بھی تو بن سکتی ہیں۔'' وقار حسن نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں کہ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ پاکستان کو بہت دکھ دیتے ہیں اسے رلاتے

ہیں اور پھر اسے روتا پاکستان کہتے ہیں ..... خود ہی گندگی پھیلاتے ہیں اور پھر گندا پاکستان کہتے ہیں۔ ..... ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں اور پھر اسے ظالم پاکستان کہتے ہیں ..... کوئی کچھ بھی کہے میرا ایمان ہے کہ پاکستان بہت پیارا ہے، لیکن پاکستانی اس کا خیال نہیں رکھتے۔ اسی لیے میں نے اور خوشی نے فیصلہ کیا ہے کہ کچھ بھی ہو ہم اپنے ملک کی برائی نہیں کریں گے بلکہ اسے خوب صورت بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے ..... کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟'' اپنی بات مکمل کر کے اس نے باقی لوگوں کی جانب دیکھا۔

'' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں ..... ہم بلاوجہ مایوس ہو رہے تھے۔'' وقار حسن نے آنسو ضبط کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

'' یہ تو آغاز ہے مجھے یقین ہے کہ ایسی بے شمار چنگاریاں اور بھی ہیں جنھیں اکٹھا کر کے حب الوطنی کے بجھتے الاؤ کو دوبارہ روشن کیا جا سکتا ہے۔'' قاسم مرزا کی بات سن کر سب کے منہ سے بیک وقت ان شاء اللہ نکلا جو ان کے دلوں میں پیدا ہونے والے نئے جوش اور حوصلے کی واضح دلیل تھا۔

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو

میں سفید لباس پہنے چارپائی پر چت لیٹا تھا۔ میرے اردگرد میرے عزیز و اقارب جمع تھے۔ وہ سب رو رہے تھے۔ عورتیں بَین کر رہی تھیں۔ مجھے ان کے بَین کرنے سے تکلیف پہنچ رہی تھی۔ میں ان کو منع کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس قابل نہیں تھا۔ میں تو صرف ان کو دیکھ سکتا تھا اور ان کی باتیں سن سکتا تھا۔

کچھ سمجھ دار عورتوں نے بَین کرنی والی عورتوں کو سمجھایا کہ رونے کے بجائے کلمہ یا درود شریف پڑھو۔ ان کے کہنے پر کچھ عورتوں نے بلند آواز سے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ جب کہ کچھ منہ ہی منہ میں درود شریف وغیرہ پڑھنے لگیں۔ اس طرح

مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ میں چارپائی پر لیٹا اپنے بارے میں سوچنے لگا۔

میں نے ایک اوسط درجے کے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ گھر کے حالات زیادہ اچھے نہ تھے۔ میں جوں جوں بڑا ہوتا گیا، میرے دل میں ترقی کرنے کی امنگ بڑھتی چلی گئی۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اپنی محنت اور قابلیت سے اپنے خاندان کا نام روشن کروں گا۔ خوب دولت کماؤں گا اور اپنے گھر والوں کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔ اپنی اولاد کی تمام حسرتیں پوری کر کے اپنی ناتمام حسرتوں کو تسکین فراہم کروں گا۔

ترقی کرنے اور زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کی ضد اُس روز سے میرے دل میں پیدا ہوئی تھی جب ایک روز چودھری کے بیٹے کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا۔ زیادتی چودھری کے بیٹے کی تھی لیکن چودھری نے مجھے اور میرے والد کو بلوا کر برہمی کا اظہار کیا تھا۔ میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا تھا لیکن والد صاحب نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اس وقت گاؤں کے کچھ ایسے افراد بھی وہاں موجود تھے جن کے سامنے چودھری کے بیٹے کے ساتھ میرا جھگڑا ہوا تھا۔ وہ اس بات کے گواہ تھے کہ میں بے قصور تھا لیکن ان میں سے کسی نے میری حمایت نہیں کی۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ یہاں معزز وہی ہے جو دولت مند اور طاقت ور ہے خواہ وہ غلطی پر ہو۔ حق پر ہونے کے باوجود اس روز میں بے عزت ہوگیا تھا۔ اس روز میں نے تہیہ کرلیا کہ میں صرف غربت کی وجہ سے اپنے بچوں کو اس طرح شرمندہ یا بے عزت نہیں ہونے دوں گا۔

میں نے دل لگا کر تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر آ گیا۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے

کے ساتھ ساتھ شام کو ایک اخبار میں کام کرنے لگا۔ میرے دل میں کسک تھی، لگن تھی، جذبہ تھا، ولولہ تھا، مجبور و مظلوم لوگوں کا درد تھا۔ لہٰذا میرے اخباری کالم پسند کیے جانے لگے۔ تمام طبقوں میں میری عزت بڑھنے لگی۔ ایم اے ابلاغیات کا امتحان پاس کرنے کے چھ ماہ بعد ہی ایک بڑے اخبار نے مجھے ڈپٹی ایڈیٹر کے عہدے، اچھی تنخواہ اور معقول مراعات کی پیش کش کی جسے میں نے قبول کرلیا۔

میں نے گاؤں میں مزید زمین خرید کر بہت بڑی حویلی بنوائی۔ اب میں جب بھی گاؤں جاتا۔ گاؤں کا تھانیدار، پٹواری اور دیگر لوگ میرے لیے آنکھیں بچھائے پھرتے تھے۔ میں اگر چاہتا تو گاؤں کے چودھری اور اس کے بیٹے سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکتا تھا۔ میرے ایک اشارے پر ان کو کسی نہ کسی بہانے بے عزت کر دیا جاتا۔ لیکن خدا کا خوف اور والدین کی اچھی تربیت کا اثر مجھ پر کافی گہرا تھا۔ لہٰذا میں نے ایسا نہیں کیا میں کسی کو بے عزت کر کے اپنی عزت بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

گاؤں میں میری آمد پر حویلی میں میلا سا لگا رہتا۔ لوگ اپنے مسائل لے کر آتے اور میں اپنے اثر و رسوخ سے ان کے مسئلے حل کرا دیتا۔ میں نے اپنے بھائیوں اور بہت سے رشتے داروں کو گاؤں میں جگہ لے کر آباد کرایا۔ گاؤں کا چودھری مجھ سے خائف رہنے لگا تھا۔ وہ صرف نام کا چودھری رہ گیا تھا۔ وہ میری خوشنودی حاصل کرنے کی بہت کوششیں کرتا رہا لیکن میں نے اس سے حدِ فاصل قائم رکھی۔ چودھری کی حویلی کی بجائے اب میری حویلی گاؤں کے لوگوں کی توجہ اور امیدوں کا مرکز تھی۔

مجھے اللہ نے چھ بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا۔ میں نے ان کی عمدہ تربیت کی۔ میں ہفتے میں دو دن گاؤں میں گزارتا۔ گھر والوں کے کہنے کے باوجود میں نے رہائش گاؤں سے شہر منتقل نہیں کی۔ شہر میں میرے شب و روز بہت مصروف گزرتے لیکن جب میں گاؤں آتا تو مجھے سکون مل جاتا۔ جب میں اپنے جوان بیٹوں، بھائیوں اور عزیزوں میں ہوتا تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔ آج میرے پاس مال و دولت اور اولاد سب کچھ تھا۔ معاشرے میں میری عزت تھی۔ گاؤں کے لوگ مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ میں ان کی خوشی اور غم میں شریک ہوتا تھا۔ کئی ایسے گھرانے تھے جن کا چولھا میری امداد پر چلتا تھا۔

میں نے اپنی اولاد یا رشتہ داروں کو کبھی اس بات کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ دولت یا طاقت کے نشے میں کسی غریب کی بے عزتی کریں یا کسی کو اپنے سے کم تر سمجھیں۔ تمام تر پیار محبت کے باوجود میرا رعب ان پر قائم تھا اور مجھے خوشی تھی کہ وہ میرے مزاج کے خلاف کوئی بات یا کام نہیں کرتے تھے۔ میرا کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ میرے اثر و رسوخ اور دولت سے حل ہو جاتا یا میرے بچے اور عزیز مل کر حل کر لیتے۔ میں سمجھتا تھا کہ طاقت، اختیار اور دولت سے ہر کام ہو سکتا ہے۔ ہر چیز خریدی جا سکتی ہے، لیکن میں ان سب کو جائز کاموں کے لیے ہی استعمال کرتا تھا۔

ایک روز میں گاؤں میں موجود تھا۔ حویلی میں گاؤں کے بہت سے لوگ مجھے ملنے آئے ہوئے تھے۔ میرے بیٹے اور عزیز بھی میرے پاس بیٹھے تھے۔ ملازم آنے والے لوگوں کی تواضع کر رہے تھے۔ میں سب کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ میں خود کو کسی

ملک کا بادشاہ سمجھ رہا تھا، جو دربار لگائے بیٹھا ہو۔ اتنے میں میرے سینے میں شدید درد اٹھا۔ اور میں پسینے سے بھیگ گیا۔ میں نے زور سے اپنے دل کو تھام لیا۔ سارے لوگ ایک دم پریشان ہوگئے۔ مجھے فوراً گاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ میری بگڑی ہوئی حالت کے پیشِ نظر ڈاکٹر نے مجھے شہر لے جانے کی ہدایت کی۔

شہر کے بہترین ہسپتال میں بہترین ڈاکٹروں نے میرا علاج شروع کیا۔ لیکن میری حالت کبھی سنبھل جاتی، کبھی بگڑ جاتی۔ ڈاکٹروں نے مجھے بیرون ملک لے جانے کا مشورہ دیا۔ بیرون ملک روانگی سے پہلے ہی پیغامِ اجل آ گیا اور میں زندگی کی بازی ہار گیا۔ میں اپنے تمام تر اثر ورسوخ اور مال و دولت کے باوجود زندگی نہ خرید سکا۔ پہلی مرتبہ مجھے اپنی بے بسی اور کم مائیگی کا احساس ہوا۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میرے مرتے ہی میرے بیٹوں نے میری جیبوں سے ساری رقم نکال لی۔ میری گھڑی اتار لی گئی۔ میں تو اپنے بیٹوں کی جیبیں ہر وقت بھری رکھتا تھا لیکن آج میرے بیٹے ہی میری جیبیں خالی کر رہے تھے۔ زندگی کی دولت کے ساتھ ہی دنیا کی دولت بھی چھن رہی تھی۔ مجھے نہلا کر سفید چادر میں لپیٹ کر چارپائی پر ڈال دیا گیا۔ اب میں نے جو لباس پہنا ہوا تھا اس میں کوئی جیب نہیں تھی اور میرے ہاتھ بالکل خالی تھے۔

میری بیوی اور بیٹیاں فرطِ غم سے نِڈھال ہو رہی تھیں۔ میرے بیٹے بھی ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہے تھے۔ میرے بھائی، میرے رشتے دار سب اشک بار تھے۔ دکھ ان کے چہروں سے عیاں تھا۔ گاؤں کی عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی

تھیں ۔ اور کہہ رہی تھیں کہ اب ہماری دادرسی کون کرے گا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری موت سے زیادہ اِنھیں اپنی امداد بند ہو جانے کا دکھ تھا۔ اس بات سے مجھے کچھ تکلیف پہنچی ۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ لوگ صرف اپنے اپنے مفادات کی وجہ سے مجھے عزیز رکھتے تھے۔ میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ ایک آواز ابھری۔ ''چلو بھئی جنازہ اٹھاؤ۔ زیادہ دیر نہ کرو۔''

یہ آواز میرے بڑے بھائی کی تھی ۔ یہ وہی بھائی تھا جو مجھے اپنے پاس سے اٹھنے نہیں دیا کرتا تھا۔ میں جب بھی اٹھنے لگتا، مجھے بٹھا لیتا۔ کہتا کہ ابھی جی نہیں بھرا اور ہم گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے ۔ آج وہی بھائی کہہ رہا تھا کہ جنازہ جلدی اٹھاؤ۔ جوں ہی میری چارپائی کو اٹھایا جانے لگا میری بیوی اور بیٹیاں میری چارپائی کے ساتھ چمٹ گئیں ۔ مجھ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی ۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے ان سے جدا کیا جائے ۔ لیکن آج میرے بس میں کچھ بھی نہ تھا۔ میری چارپائی کو کندھوں پر اٹھایا گیا۔ ایک کہرام مچ گیا۔ لوگوں کے کندھوں پر میرا سفرِ آخرت شروع ہو گیا۔ عورتیں روتی چیختی حویلی کے دروازے تک آ کر رک گئیں ۔

میں نے جب اپنے جنازے میں شریک لوگوں کو دیکھا تو ایک مرتبہ پھر مجھے ایک احساسِ تفاخر پیدا ہوا۔ ایک جَمِ غفیر میرے جنازے میں شامل تھا۔ گاؤں کے امیر غریب، اعلیٰ سرکاری افسران، سیاست دان غرض ہر طبقے کے لوگ میرے جنازے میں شریک تھے۔ میں سوچنے لگا کہ ان کو اب مجھ سے کیا مفاد ہو سکتا ہے۔ لیکن جب میری

نمازِ جنازہ پڑھی جانے لگی تو ان میں سے ہر کوئی پہلی صف میں کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ تا کہ اگلے دن اخباروں میں ان کی تصویریں آ سکیں۔ زیادہ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے نمازِ جنازہ ایک کھلے میدان میں پڑھائی گئی۔ نمازِ جنازہ کے بعد جب قبرستان کی طرف روانگی ہوئی تو میں نے دیکھا آدھے سے بھی زیادہ لوگ واپس جا رہے تھے۔ مجھ پر حیرتوں کے در کھلتے جا رہے تھے۔ جب میرا جنازہ قبرستان کے پاس رکھا گیا تو قبر کو دیکھ کر مجھ پر وحشت طاری ہوگئی۔ اتنی بڑی حویلی میں رہنے والا اتنی تنگ اور تاریک قبر میں رہے گا۔ مجھے قبر میں اتار کر سیمنٹ کی سلوں سے قبر کو بند کیا جانے لگا۔ میں رونے اور چلانے لگا لیکن کسی کو میری آواز نہیں سنائی دے رہی تھی اور پھر میری قبر پر مٹی ڈالی جانے لگی۔ یہ سب میرے اپنے کر رہے تھے۔ میرے بیٹے، بھائی اور رشتہ دار مجھے منوں مٹی تلے دفن کر رہے تھے۔

مجھے دفن کرنے کے بعد سب نے دعا مانگی اور واپس ہونے لگے۔ میں نے ان کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔

"رک جاؤ، مجھے یوں اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ، کوئی میرے پاس رک جائے۔" وہ سب تھوڑی دور جا کر رک گئے۔ میں سمجھا انھوں نے میری صدائیں سن لی ہیں۔ اب ان میں سے کوئی میرے پاس ضرور رک جائے گا۔ لیکن انھوں نے وہاں کھڑے ہو کر دوبارہ دعا مانگی اور واپس چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں حیران تھا کہ آج سب کو کیا ہو گیا ہے۔ آج سب مجھ سے اتنے بیگانے کیوں ہو گئے ہیں۔ غیروں کا کیا شکوہ کرنا، آج تو میرے اپنوں نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ میں اپنے جن اہل و عیال پر فخر کیا کرتا تھا، آج وہ سب مجھے اس تاریک کوٹھڑی میں اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ آج میں بالکل تہی دست و تہی دامن ہو گیا تھا۔

قبر میں جب میری وحشت بڑھنے لگی تو میں نے دیکھا کہ میری قبر میں روشنیاں بکھر رہی ہیں ۔ان روشنیوں سے میری قبر منوّر ہوگئی اور ساتھ ہی میری قبر کی دیواریں مجھ سے دور ہٹنے لگیں اور میری قبر تاحدِ نگاہ کشادہ ہوگئی ۔ٹھنڈی اور معطر ہواؤں کے جھونکوں نے مجھے مسحور کر دیا۔ میں محسوس کرنے لگا کہ میں اکیلا نہیں ہوں ۔میرے اردگرد کوئی ہے۔

میں نے غور کیا تو مجھ پر منکشف ہوا کہ میری نیکیاں اور نیک اعمال ہیں ۔ایک ایسے وقت میں جب میرا مال، میرے اہل وعیال اور دوست احباب سب میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے، میرے اعمال میرا ساتھ نبھانے آ پہنچے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ دنیا میں اگر میں نے صرف اپنے مال اور اہل وعیال پر ہی بھروسا کیا ہوتا اور اچھے اعمال سے غفلت برتی ہوتی تو آج میں کتنا اکیلا ہوتا اور نہ جانے میرا انجام کیا ہوتا ۔آج یہ حقیقت مجھ پر عیاں ہوئی تھی کہ انسان کے اچھے اعمال ہی اس کے اصل ساتھی ہیں ۔ جب مال اور اہل وعیال سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں تو اچھے اعمال ہی انسان کا آخر تک ساتھ نبھاتے ہیں ۔میں اس پر لطف فضا میں سکون سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ اس وقت تک کے لیے جب مجھے دوبارہ اٹھایا جانا تھا۔لیکن مجھے اس کا کوئی خوف نہ تھا کیوں کہ میرے اصل ساتھی میرے نیک اعمال میرے ساتھ تھے۔

فاطمہ بنتِ عبداللہ

تاریخِ اسلام میں حق و باطل کے بہت سے معرکے ملتے ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں طرابلس (موجودہ ملک لیبیا) میں ایسا ہی ایک معرکہ پیش آیا جو جنگِ طرابلس کے نام سے مشہور ہے۔ علامہ اقبال کی ایک نظم ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' اسی یادگار واقعے سے متعلق ہے۔

فاطمہ، شیخ عبداللہ کی بیٹی تھی جو اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ وہ گیارہ برس کی تھی جب جنگِ طرابلس کا واقعہ پیش آیا۔ اس جنگ میں ایک طرف اطالوی تھے جن کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ ان کے مقابلے میں تُرک اور عرب مسلمانوں کی نفری صرف تین ہزار تھی۔ مسلمانوں کے لیے بڑا نازک موقع تھا۔ اطالوی، لیبیا پر چڑھ دوڑے تھے اور وہاں قبضہ کر کے مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتے تھے۔ چناں چہ اپنے دفاع کے لیے مسلمان مردوں کے ساتھ عورتیں بھی میدان میں نکل آئیں۔ مرد تو میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دے رہے تھے اور عورتیں لڑائی کی پچھلی صفوں میں زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں۔ فاطمہ بھی اِنھیں میں شامل تھی۔ وہ اپنا مشکیزہ کندھے سے لٹکائے بڑے ذوق و شوق سے سپاہیوں کو پانی پلانے کی خدمت بجالا رہی تھی۔

مسلمانوں کے ہاں یہ ایک پرانی روایت تھی۔ دورِ رسالت میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ غزوۂ اُحد میں مسلم خواتین نے حالتِ جنگ میں غازیوں اور زخمیوں کو پانی پلانے کا کام سرانجام دیا تھا۔ اِسی طرح وہ حسبِ ضرورت طبی خدمات بھی بجالاتی رہیں۔

ماہِ جون میں اوّل تو گرمی کی شِدّت ، پھر صحرا میں چلنے والی گرم لُو ، ایسے میں میدانِ جنگ میں ٹھہرنا بڑے جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے ۔ گھمسان کی جنگ جاری تھی ۔ اطالویوں کی گولا باری سے یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے آگ برس رہی ہو۔ ریت اُڑ اُڑ کر فاطمہ کے چہرے ، گردن اور بالوں پر جم گئی تھی ، مگر وہ جذبۂ خدمت سے سرشار تھی ۔ نہایت انہماک اور تن دہی کے ساتھ وہ زخمیوں کو پانی پلانے میں لگی ہوئی تھی ۔ اسی عالم میں اس نے جامِ شہادت نوش کیا۔

فاطمہ کی شہادت کا واقعہ اس طرح ہے کہ میدانِ جنگ میں چند مسلمان مجاہد زخم کھا کر گرے تھے۔ فاطمہ انھیں پانی پلانے کے لیے آگے بڑھی اور انھیں پانی پلانا چاہا۔ اس پر ایک بد بخت اطالوی سپاہی نے اس کا گریبان پکڑ کر کھینچا۔ فاطمہ بپھر کر اُٹھی ۔ اس نے زخمی مجاہد کی تلوار لی اور حملہ آور اطالوی پر تلوار کا ایک بھرپور وار کیا۔ اطالوی کا ہاتھ کٹ کر لٹک گیا۔ اُس نے غصّے میں آ کر فاطمہ پر بندوق کا فائر کھول دیا اور فاطمہ ربِّ اعلیٰ سے جا ملی ۔ اس جنگ میں فاطمہ ، اس کے والدین اور تمام رشتے دار شہید ہو گئے ۔

اطالویوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد ایک چوتھائی تھی، مگر جس ایمانی جذبے کا مظاہرہ فاطمہ نے کیا تھا وہ تمام مسلمانوں میں کارفرما تھا۔ چناں چہ کم تعداد کے باوجود انھیں دشمن پر فتح نصیب ہوئی۔

حادثہ یا زندگی کا نیا موڑ

آج کا دن میرے تمام یادگار دنوں کی فہرست میں سب سے اہم اور خوش قسمت ترین دنوں میں سے ایک تھا۔ آج میرے اساتذہ کرام کی محبت یا ان کی شفقت و محنت، میری لگن اور میرے والدین کی دعائیں اور قربانیاں رنگ لائی تھیں۔ آج مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنا تھی۔ کتنی خوش تھی میں۔ ڈگری ملنے کے بعد میں ڈاکٹر عبیرہ احمد کہلاؤں گی۔ جو لوگ علم و ادب پر تحقیقی کام کرتے ہیں اور نئے نئے پہلو متعارف کرواتے ہیں تو اِنھیں یونیورسٹیوں کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی جاتی ہے۔ یہ میرا خواب تھا جو آج شیرانی ہال میں پورا ہونے والا تھا۔ صدرِ محترم اور مہمانِ خصوصی کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ میری تحقیق کا موضوع علامہ اقبالؒ تھے۔

علامہ اقبال سے کب میری دلچسپی اتنی بڑھی کہ میں نے پی ایچ ڈی کے لیے علامہ اقبال ہی کے نام کا انتخاب کیا؟ اس کے لیے آپ کو میرے ساتھ ماضی میں چلنا ہوگا۔ یہاں یہ روایتی بات ہرگز نہیں کروں گی کہ مجھے بچپن ہی سے علامہ اقبال کی نظمیں بہت پسند تھیں۔ پھر بڑے ہو کر بہت اچھے لگنے لگے اور پھر وہ میرے پسندیدہ شاعر بن گئے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے نئی نئی گاڑی چلانا سیکھی تھی۔ اُن دنوں میں بی ایس سی کے امتحانات سے فارغ ہوئی تھی۔ گھر کی ذاتی گاڑی چلانے کی اجازت ابو جان نہیں دیتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ بیٹی اور گاڑی دونوں سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتے۔ چلو گاڑی کے

اسپیر پارٹس (فاضل پرزے) تو مل جائیں گے۔ بیٹی کے اسپیر پارٹس کہاں سے ملیں گے؟ اس لیے جب تک تم کسی ادارے سے گاڑی چلانا نہ سیکھ لو اور وہ تمھیں مہارت کی سند نہ دے دیں، تب تک تمھیں گاڑی تنہا لے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ میں اس بات پر ہمیشہ خوش دلی سے ہنس دیتی۔ پھر میں نے ایک ٹریننگ سینٹر سے کئی مہینوں کی محنت کے بعد ڈرائیونگ میں مہارت حاصل کر لی تو ابا جان نے بھی گاڑی چلانے کی اجازت دے دی۔

انارکلی بازار میں شاپنگ مکمل کرنے کے بعد جب میں نے گاڑی کو پیچھے کیا تو گاڑی کسی چیز سے ٹکرائی۔ دھم کی آواز کے ساتھ ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ میں بوکھلا کر نیچے اتری تو دیکھا کہ ایک لڑکی سڑک پر اوندھے منہ گری ہوئی ہے اور اس کی

کتابیں زمین پر بکھری ہوئی ہیں۔کوئی طالبہ لگتی تھی بے چاری۔ میں نے جلدی سے اسے سیدھا کیا۔اس کے ماتھے پر زخم آیا تھا جس سے خون رِس رہا تھا۔شلوار گھٹنے سے تھوڑی سی پھٹ گئی تھی اور گھٹنا خون آلود تھا۔لڑکی بے ہوش تھی، غالباً اپنے دھیان میں جا رہی ہوگی کہ ٹکر لگنے سے ایک دم سے گر پڑی اور شاید گرتے ہوئے کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہاں اسکول میں لی ہوئی گرل گائیڈ کی ٹریننگ کام آئی۔ میں نے اسے ایک اور لڑکی کی مدد سے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ اس لڑکی کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹ کر اگلی سیٹ پر رکھ دیں۔ اس کی چپٹی بند آنکھیں، گول مٹول صاف چہرہ، دہری ٹھوڑی اور ہونٹوں کی مخصوص بناوٹ سے وہ کوئی غیر ملکی دکھائی دیتی تھی۔

آس پاس کے لوگ یوں گزر رہے تھے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور جو بھیڑ بنا کر کھڑے تھے ان کے لیے یہ محض تماشا تھا۔ایک خوب صورت تماشا کہ ایک نقاب پوش لڑکی نے کسی لڑکی کو ٹکر ماردی اور اب وہ اسے اپنی گاڑی میں لے کر جا رہی ہے۔ میں نے ہارن بجا کر لوگوں کو منتشر کیا۔ شیشے اچھی طرح بند کر لیے اور گاڑی زن سے اڑا لے گئی۔

''اف خدایا! یہ کیا ہوا!'' پچھتاوے نے مجھے آ گھیرا تھا۔ذہنی دباؤ سے بچنے کے لیے میں نے قرآن مجید کی کیسٹ لگا لی اور میری گاڑی کا رخ ابو کے پرائیوٹ کلینک کی طرف تھا۔ابو نے بے ہوش لڑکی کو ابتدائی طبی امداد دی، زخم دھویا۔کوئی کانچ کا ٹکڑا پورا کا پورا لڑکی کے گھٹنے میں پیوست ہو گیا تھا۔انھوں نے انجکشن لگائے

اور اس کی پٹی کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''ایسے اور کتنے ماروگی! ہوگئیں ناشروعات! شہر میں دو چار اور ایسے حادثے ہوگئے تو فلم والوں اور پولیس کی نظروں میں ضرور ہماری یہ ہنگامہ خیز گاڑی آجائے گی۔''

''خدا کے لیے ابو..... ایسی بات نہ کریں!'' میری جان ہی نکل گئی۔

ابو اس کی مرہم پٹی کرنے کے بعد مختلف گولیاں مجھے تھماتے ہوئے کہنے لگے۔

''اب اس لڑکی کو احتیاط سے گھر لے جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ یہ دہشت کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی ہے۔''

جب میں گھر پہنچی تو سب لوگ صورتِ حال جان کر بہت پریشان ہوئے۔ سب سے بری حالت میری تھی۔ کمپاؤنڈر نے ابو کی ہدایت کے مطابق ڈرپ لگا دی تھی۔

''کون ہے یہ لڑکی؟''

''اگر یہ ہوش میں نہ آئی تو!''

''اگر یہ فوت ہوگئی تو!''

سوالات کی یلغار میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ کوئی سراغ پانے کے لیے میں اس کی کتابیں دیکھنے لگی۔ ایک کتاب نے مجھے بے ساختہ چونکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ ''کلیاتِ اقبال'' (علامہ اقبال کی شاعری کا مجموعہ) تھی۔ جس کے پہلے صفحے پر لی موراچنگ چو اور ساتھ بریکٹ میں پاکستانی نام صدف لکھا تھا۔ ''کلیاتِ اقبال'' کے بہت سے خوب صورت اشعار پر پینسل کے نشان لگے ہوئے تھے۔ کچھ غزلوں، نظموں اور اشعار پر اشارات اور الفاظ معنی لکھے ہوئے تھے۔ کتاب کا حلیہ بتاتا تھا کہ یہ کتاب اکثر و بیش تر ہی

مطالعے میں رہتی ہے۔ ایک اردو لُغت تھی۔ فائل میں ایک دستہ پڑا ہوا تھا۔ جس پر ''اقبالیات'' لکھا تھا۔ یہاں بھی وہی نام تھا۔ اردو کے الفاظ معنی لکھے ہوئے تھے۔ کچھ اشعار کی تشریح لکھی ہوئی تھی۔ اردو کی گردانیں لکھیں تھیں۔ فارسی کی گردان بھی موجود تھی۔ جا بجا غلطیوں والے جملے تھے جنھیں تیزی سے لکھا گیا تھا۔ کچھ لیکچرز پر مبنی نوٹس تھے۔

ایک صفحے پر میری نگاہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ مضمون تھا ''میرا پسندیدہ شاعر'' اس میں اُس نے اقبال کے بارے میں لکھا تھا اور آخر میں مجھے ایک پیراگراف چونکا گیا۔

''مجھے اپنے پیدا کرنے والے سے سب سے بڑا شکوہ یہ ہے کہ اس نے مجھے اقبال کے عہد میں کیوں نہ پیدا کیا۔ کاش! میں اتنے بڑے اور عظیم شخص کی کوئی بہن، بیٹی اور کوئی ساتھی ہوتی۔ کاش! میں اقبال جیسے عظیم شاعر کی قوم میں پیدا ہوتی۔ اقبال جیسے شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔''

چھوٹے چھوٹے جملے جس میں قواعد اور زبان کی غلطیاں موجود تھیں، لیکن جملوں سے چھلکتی محبت، عقیدت، اقبال شناسی اور خوب صورت الفاظ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ایک جگہ اردو میں ایک ایسا ہی روزمرہ کے معمولات پر پیراگراف لکھا تھا۔ جس طرح ہم اپنی انگلش بہتر بنانے کے لیے لکھتے ہیں اور چیک کرواتے ہیں۔ ان صفحات پر کہیں کہیں عجیب وغریب زبان کے الفاظ بھی لکھے ہوئے تھے۔

''کیا یہ لڑکی چینی ہے یا جاپان سے آئی ہے؟''

''اُف اللہ! اس کے گھر والوں پر کیا گزر رہی ہوگی؟''

''کیا یہ یہاں اکیلی رہتی ہے؟''

''اگر یہ غیر ملکی ہے تو اب تک تو اس کے سفارت خانے میں اس کے لاپتا ہونے کی خبر پہنچ چکی ہوگی۔''

''اُف! چین اور جاپان تو اس اغوا پر پاکستان سے دوستی ختم کر دیں گے۔''

''وہ چین یا جاپان سے اردو پڑھنے کے لیے آئی ہے، آخر کیوں؟''

''کیا علامہ اقبال واقعی ایسی چیز ہیں کہ اِنھیں چینی اور جاپانی پڑھنے کے لیے یہاں پاکستان میں آئیں۔'' میں بہت حیران تھی۔

''اُف! نو بج گئے۔ بے وقوف لڑکی! تمھاری اطلاع اگر دوں بھی تو کہاں دوں''۔ میری پریشانی غصے اور فکر میں تبدیل ہو رہی تھی۔ پڑوس میں کسی نے چین کے بارے میں کوئی تبصرہ کیا تو میں فکر مند چہرہ لیے ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھی۔ یقیناً اسی کے بارے میں کچھ ہوگا لیکن وہاں کوئی بحری مشقوں کا ذکر تھا۔ محکمۂ فون کے 17 سے پنجاب یونی ورسٹی شعبۂ اردو انکوائری آفس اور لڑکیوں کے ہاسٹلز کے فون نمبرز لے لیے، لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں فون کروں۔

''اُف مالک! اگر کوئی گواہی دینے والا مل گیا اور پولیس یہاں پہنچ گئی تو.....''

''گاڑی کی نشان دہی ہوگئی تو.....''

''اس سے تو اچھا تھا کہ لگتے ہی زن سے گاڑی بھگا لے جاتی۔ میری بلا سے کچھ بھی ہوتا۔''

مگر پھر اپنے آپ کو شدید ملامت کی۔ پولیس کا خوف اب بھی ننگی تلوار بن کر

لٹک رہا تھا۔ (اللہ اس ملک کی پولیس سے بچائے رکھے) امی جان اس کے حلق میں نیم گرم دودھ ٹپکا رہی تھیں۔ دادی جان اس کی ہتھیلیاں مَل رہی تھیں۔ سب لوگ فکر مند چہرے اور پریشان دل لیے کھڑے دعائیں مانگ رہے تھے۔

خدا خدا کر کے اجنبی دیس کی نامعلوم شہزادی نے آنکھیں کھولیں تو ہم سب اس پر بے تابی سے جھک گئے۔ وہ یک دم اپنے آپ کو ایک اجنبی ماحول اور لوگوں میں بیٹھا دیکھ کر بری طرح ڈر گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

''آپ صدف ہیں؟ اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟ مجھے معاف کر دیں۔ آپ میری گاڑی سے ٹکرا گئی تھیں۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ پلیز! مجھے معاف کر دیں۔'' جب دیکھا کہ انگلش بے اثر ہے تو اردو میں معذرت کی۔

''آپ جرمانہ لینا چاہتی ہیں تو پلیز لے لیں مگر پولیس کو اطلاع نہ دیجیے گا۔'' میں اس کے مسلسل گھورنے پر پریشان ہو کر بولی۔ ''یا خدا! یہ گونگی تو نہیں۔'' میں گھبرائی۔

''اچھا! آپ مجھے زیادہ شرمندہ نہ کریں۔'' وہ ایک دم ہنس پڑی۔ بادل چھٹ گئے۔ اتنا صاف لہجہ۔ پھر اس نے کھانا ہمارے ساتھ کھایا۔ اپنے ہاسٹل کی نگران کو فون پر اس نے دیر سے آنے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ چین سے اقبالیات میں ڈگری حاصل کرنے کے لیے آئی تھی اور پنجاب یونی ورسٹی کی طالبہ تھی۔ جتنی دیر ہمارے ساتھ رہی، بڑی عقیدت اور والہانہ پن سے اقبال کا ذکر کرتی رہی۔ اس کا اُکھڑا اُکھڑا لہجہ اس بات کی کہیں کہیں چغلی کھاتا تھا کہ وہ مقامی نہیں ہے۔ حالاں کہ شاید اس کی اردو اور معلومات مجھ سے بہتر تھیں۔ کھانے کے بعد میں اور میرا بھائی حمزہ اس کے ہاسٹل اسے

چھوڑنے گئے۔ یہ زبان سچ مچ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جس سے لوگ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھاتے ہیں۔

لی مورا شاید یہ بات نہ جانتی ہو کہ اس کی اقبال سے عقیدت نے مجھے بہت حیران کیا تھا، بہت مرعوب کیا تھا۔ اور شاید پہلی دفعہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ میں اقبال کے بارے میں کیا جانتی ہوں۔ بس یہی کہ وہ ہمارے قومی وملی شاعر ہیں۔ پاکستان کا خواب انھوں نے دیکھا تھا۔ لی مورا سے زیادہ میرا حق اقبال پر تھا اور میری لائبریری میں کلیاتِ اقبال شاید لائبریری کی زینت کے لیے ہی تھی۔ اسے پڑھنے کی کبھی فرصت نہ ملتی تھی یا اس قابل ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اقبال کا خیال شاید اس لیے بھی نہیں آتا تھا کہ اپنی چیز اپنی ہوتی ہے اور اس کی قدر و قیمت بھی کم ہوتی ہے، لیکن لی مورا کی اقبال میں دلچسپی، عبور، شوق اور لگن نے مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ کلیاتِ اقبال پڑھوں تو سہی۔ سچ کہتی ہوں کہ ایک نئی دنیا کی سیر ہاتھ لگی تھی۔ سائنس سے ہٹ کر ایک نئی دنیا۔ پھر کلیاتِ اقبال اکثر میری میز پر نظر آنے لگی۔

جب بی ایس سی کا رزلٹ آیا تو میرے آگے کے ارادے سن کر گھر میں مخالفت کا ایک طوفان گرم ہوگیا کہ بی ایس سی کے بعد ایم اے اردو کتنی بدمزہ سی بات ہوگی، لیکن میری ضد بس یہی تھی۔ میں نے بہ طور اضافی مضمون اردو کا پیپر دیا۔ انٹرویو کے بعد میرا داخلہ ایم اے اردو میں ہوگیا۔ کیسے ہوا اور کن مراحل سے گزر کر میرا ایم اے مکمل ہوا، یہ ایک بہت لمبی داستان ہے۔ مجھے اپنی پوزیشن برقرار رکھنے کے لیے دن رات محنت کرنی پڑی۔ پھر میں نے ایم فِل اور پی ایچ ڈی کے مقالے

کے لیے شعبۂ اقبالیات کو ہی چُنا۔

جوں جوں میں اقبال کے مطالعے میں آگے بڑھتی گئی توں توں مجھ پر کھلتا گیا کہ اقبال واقعی ایک عالمی شاعر جیسی خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں۔ وہ قرآن کے مفسر ہیں۔ ان کے افکار ہر زمانے، ہر عہد کے لیے ہیں۔ جب تک دنیا میں خیر و شر کا معرکہ جاری رہے گا تب تک اقبال کی شاعری زندہ رہے گی۔ چین اور جاپان علامہ اقبال کو صرف پڑھتے یا پڑھاتے ہی نہیں بلکہ عملی زندگی کے ہر میدان میں ان کی تعلیمات کو اپناتے ہیں اور یہ راز اُن کی عالمی اقوام میں مضبوطی اور برتری کا نشان ہے۔

ہال میں بینڈ کی مخصوص دُھن اور تالیوں نے مجھے واپس شیرانی ہال (پنجاب یونی ورسٹی) میں لا کھڑا کیا۔ مہمانِ خصوصی تشریف لے آئے تھے اور پھر پی ایچ ڈی کرنے والوں کو ڈگریاں دی جانے لگیں۔ اپنی ڈگری وصول کرتے ہوئے میرے دل میں لی مورا کے لیے شکر گزاری کے جذبات امنڈ رہے تھے۔

''میری دوست! اگر تم سے وہ ملاقات نہیں ہوتی تو شاید آج میں صرف عبیرہ احمد ہوتی ڈاکٹر عبیرہ احمد نہ کہلاتی۔''

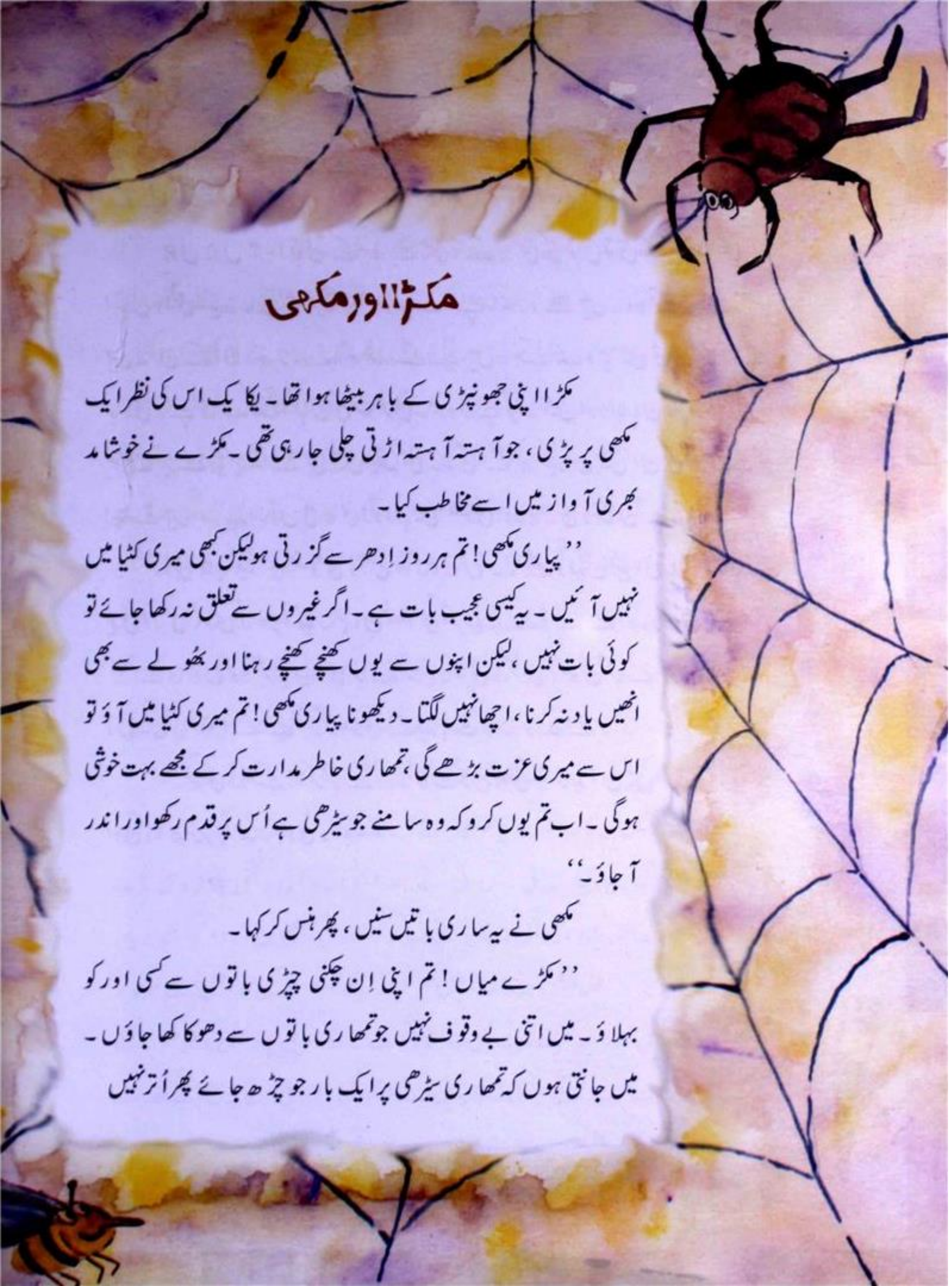

مکڑا اور مکھی

مکڑا اپنی جھونپڑی کے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ یکا یک اس کی نظر ایک مکھی پر پڑی، جو آہستہ آہستہ اڑتی چلی جا رہی تھی۔ مکڑے نے خوشامد بھری آواز میں اسے مخاطب کیا۔

''پیاری مکھی! تم ہر روز اِدھر سے گزرتی ہو لیکن کبھی میری کٹیا میں نہیں آئیں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے۔ اگر غیروں سے تعلق نہ رکھا جائے تو کوئی بات نہیں، لیکن اپنوں سے یوں کھنچے کھنچے رہنا اور بھولے سے بھی انھیں یاد نہ کرنا، اچھا نہیں لگتا۔ دیکھو نا پیاری مکھی! تم میری کٹیا میں آؤ تو اس سے میری عزت بڑھے گی، تمھاری خاطر مدارت کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی۔ اب تم یوں کرو کہ وہ سامنے جو سیڑھی ہے اُس پر قدم رکھو اور اندر آ جاؤ۔''

مکھی نے یہ ساری باتیں سنیں، پھر ہنس کر کہا۔

''مکڑے میاں! تم اپنی اِن چکنی چپڑی باتوں سے کسی اور کو بہلاؤ۔ میں اتنی بے وقوف نہیں جو تمھاری باتوں سے دھوکا کھا جاؤں۔ میں جانتی ہوں کہ تمھاری سیڑھی پر ایک بار جو چڑھ جائے پھر اُتر نہیں

سکتا۔ میں تمھارے جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں۔'' مکڑا بولا۔

''تم جیسا سادہ اور نادان شاید ہی کوئی اور ہو۔ بھولی مکھی! مجھے تو تمھاری خدمت کرنی تھی۔ میرا اس میں اپنا کیا لالچ ہوگا۔ میں نے تو یہ سوچا کہ تم نہ جانے کتنی دور سے اڑتی آ رہی ہو۔ تھک گئی ہوگی۔ تھوڑی دیر میرے گھر ٹھہر کر آرام کر لوگی تو تمھاری تکان دور ہو جائے گی۔ پھر ایک اور بات بھی ہے۔ میرا گھر باہر سے تو چھوٹا نظر آتا ہے لیکن تم اندر آؤ تو پتا چلے گا کہ میں نے اسے کتنے چاؤ سے سجایا ہے۔ اس میں کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جنھیں دیکھ کر تم خوش ہوگی۔ دیواروں پر میں نے خوش نما آئینے جڑ رکھے ہیں اور دروازوں، کھڑکیوں کو باریک پردوں سے سجایا ہے۔ مہمانوں کے آرام کی خاطر بہت خوب صورت اور نرم بستر موجود ہیں۔ پیاری مکھی! تم ہی بتاؤ یہ سب چیزیں کہیں ایک جگہ مل سکتی ہیں؟''

مکھی ہنس کر بولی۔

''مکڑے میاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہوسکتا ہے یہ سب چیزیں تمھارے گھر میں ہوں۔ لیکن اس بھول میں نہ رہنا کہ میں تمھارے گھر میں قدم رکھوں گی۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمھارے خوب صورت اور نرم بستروں پر جو ایک بار سو جائے وہ زندہ اُٹھا نہیں کرتا۔''

مکڑے نے دل میں سوچا کہ مکھی ہوشیار ہے۔ اسے پھانسنا آسان کام نہیں۔ اس پر کوئی نئی تدبیر آزمانی چاہیے۔ مکڑا جانتا تھا کہ خوشامد ایسی چیز ہے جس سے کام چل ہی جاتا ہے۔ دنیا میں ہر کوئی خوشامد کا بھوکا ہے۔ مکڑے نے خوشامد کا ہتھیار استعمال

کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ میٹھی آواز میں بولا۔

''پیاری مکھی! تم ناحق مجھ پر شک کر رہی ہو۔ میں جو تمھاری دعوت کر رہا ہوں اور تمھیں اپنے گھر بلا رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے تمھیں اتنی عزت دی ہے، ایک بار جو تمھیں دیکھ لے تم پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اللہ نے تمھیں کیسی خوش نما آنکھیں دی ہیں، موتی کی طرح صاف و شفاف اور روشن۔ سر پر ایسی پیاری کلغی جس نے تمھارے حسن کو دوبالا کر رکھا ہے۔ تمھارا حسن، تمھارا لباس، اور اس پر خوب صورتی اور صفائی۔ پھر اُڑتے اڑتے گانے گانا، خدا نے کیسی کیسی خوبیاں تمھیں عطا کی ہیں۔''

مکھی نے جو اپنی تعریف سنی تو سب کچھ بھول گئی۔ اس کا دل پسیج گیا۔ کہنے لگی۔

''مکڑے میاں! میں خود بھی کسی کا دل دُکھانا اور بے وجہ انکار کرنا اچھا نہیں سمجھتی۔ لو میں تمھارے پاس آ جاتی ہوں۔'' مکھی نے یہ کہا اور اُڑ کر مکڑے کی طرف آئی۔ مکڑا اپنی جگہ سے اُچھلا اور اسے دبوچ لیا۔ اسے بڑے زور کی بھوک لگی تھی۔ مکھی ہاتھ آئی تو خوشی خوشی اس سے اپنا پیٹ بھرا۔ اس کی خوشامد کام کر گئی تھی اور شکار ہاتھ آ گیا تھا۔

زرخیز مٹی

استعفا.....؟؟

آفس میں بیٹھے سبھی اساتذہ کی نظریں حیرت سے پرنسپل صاحب کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ خود حیرت اور پریشانی سے نیاز صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''یہ آپ استعفا کیوں دینا چاہتے ہیں نیاز صاحب؟''

نیاز صاحب جو کسی خزاں رسیدہ بوڑھے درخت کی مانند کھڑے تھے۔ ٹیبل کے سامنے رکھی کرسی پر ایسے ڈھیر ہو گئے جیسے ایک لمحہ بھی ان سے اپنا بوجھ برداشت نہ ہوگا۔ وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولے۔

''میں تھک گیا ہوں۔ میں مایوس ہو گیا ہوں۔ میں اتنے عرصے سعیِ لا حاصل کرتا رہا..... یوں ہی .....'' ان کی آواز بھرا گئی اور آگے ان سے کچھ نہ بولا گیا۔

''لیکن ہوا کیا ہے؟ کس سے مایوس ہو گئے ہو؟ کیوں تھک گئے ہیں؟ آخر ماجرا ہے کیا؟'' معروف وڑائچ جو ان کے سب سے قریبی دوست تھے اپنی جگہ سے اٹھے اور کرسی گھسیٹ کر ان کے پاس آ کر نرمی سے پوچھنے لگے۔

''میں اس قوم سے مایوس ہو گیا ہوں .....'' آفس میں موجود سبھی اساتذہ ایک دوسرے کو حیران کن انداز سے دیکھنے لگے۔ کچھ نے دبی دبی مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔ جیسے انھیں نیاز صاحب کے استعفے کی وجہ معقول نہ لگی ہو۔ وہ سب مسکرا کر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔

''میں اس قوم ..... اس کے معماروں ..... اپنے طلبہ سے مایوس ہوگیا ہوں۔ یہ قوم پچاس برس بعد بھی یہیں رہے گی۔ یہاں سہانا مستقبل محض ایک خواب ہے۔ جس کی تعبیر ناممکن ہے۔'' وہ جذبات کی رو میں بہتے چلے گئے۔ انھوں نے اپنا موٹے شیشوں والا کالا چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور سر پکڑ کر کرسی پر مزید ڈھیلے پڑ گئے۔ شکستگی اور مایوسی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

''قوموں کی زندگی میں نشیب و فراز تو آتے ہی ہیں۔ ان سے اتنی جلدی گھبرا جانا مردانگی نہیں۔'' پرنسپل صاحب مسئلے کی سنجیدگی کو بھانپتے ہوئے بولے۔

''فراز کہاں ..... یہاں تو بس نشیب ہی نشیب ہیں۔ دلدلیں ہیں۔ گھاٹیاں ہیں .....'' نیاز صاحب انھی گھاٹیوں کے تھکے ماندے مسافر دکھائی دے رہے تھے۔

''آخر ماجرا کیا ہے؟'' معروف صاحب جھنجھلا کر بولے۔

''ہاں نیاز صاحب! مسئلہ تو بتائیں۔'' نزدیک بیٹھے ہوئے عربی کے ٹیچر نے بھی ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔ نیاز صاحب نے طویل ٹھنڈا سانس بھرا اور بولے۔

''۹ نومبر کے حوالے سے میں نے ایک مضمون نویسی کے مقابلے کا اعلان کیا تھا۔ لڑکوں سے کہا تھا کہ جو اقبال پر بہترین مضمون لکھے گا اسے ایک اچھا سا تحفہ دیا جائے گا۔ لیکن .....'' ان کی آواز کپکپا گئی۔

''ایک لڑکا بھی مضمون لکھ کر نہ لایا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ بھی کوئی موضوع ہے! نئے زمانے کے نئے تقاضے ہیں، انٹرنیٹ، کمپیوٹر، فیکس اور نجانے کیا کیا بتا رہے تھے۔'' نیاز صاحب نے لڑکوں کا مطالبہ دہراتے ہوئے بتایا۔ ''وہ کہتے ہیں ان چیزوں پر مضمون لکھوائیں ..... اونہہ..... گویا یہ مشین یہ آلات ہمارے تاریخی ہیروز سے بڑھ کر ہیں۔'' نیاز صاحب کے الفاظ فکر میں گُندھے ہوئے تھے۔

'' کہتے تو وہ بھی غلط نہیں نیاز صاحب۔'' سائنس ٹیچر ریاض علی بھی بول پڑے۔ ''اب دیکھیں نا بچوں کو ان سب چیزوں کی معلومات بھی تو ہونی چاہییں۔'' انھوں نے بچوں کی طرف داری کی۔

''لیکن ریاض صاحب ..... یہ چیزیں اخلاقیات، تہذیب، زندگی کے سنہری اصول اور ہماری اقدار سے تو ہمیں آگاہ نہیں کر سکتیں۔ ان کے لیے بہر حال اپنے عظیم رہنماؤں کی زندگی کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔'' نیاز صاحب پھٹ ہی تو پڑے۔

''بس پرنسپل صاحب بہت ہو گیا۔ اب میں چلتا ہوں۔'' انھوں نے اپنا چشمہ اٹھایا اور کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

''آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ ابھی آپ غصے میں ہیں اس لیے صحیح فیصلہ نہیں کر پائیں گے۔'' پرنسپل صاحب نے نرمی سے کہا۔ لیکن نیاز صاحب سنی اَن سنی کرتے ہوئے آفس سے باہر نکل آئے۔

''اونہہ..... فلمی ہیروز کا ایک ایک ڈائیلاگ ان سے سن لو۔ کھلاڑیوں کی ایک ایک پسند ناپسند انھیں پتا ہے۔ دنیا جہاں کے فضول ناول اور ڈائجسٹ انھیں

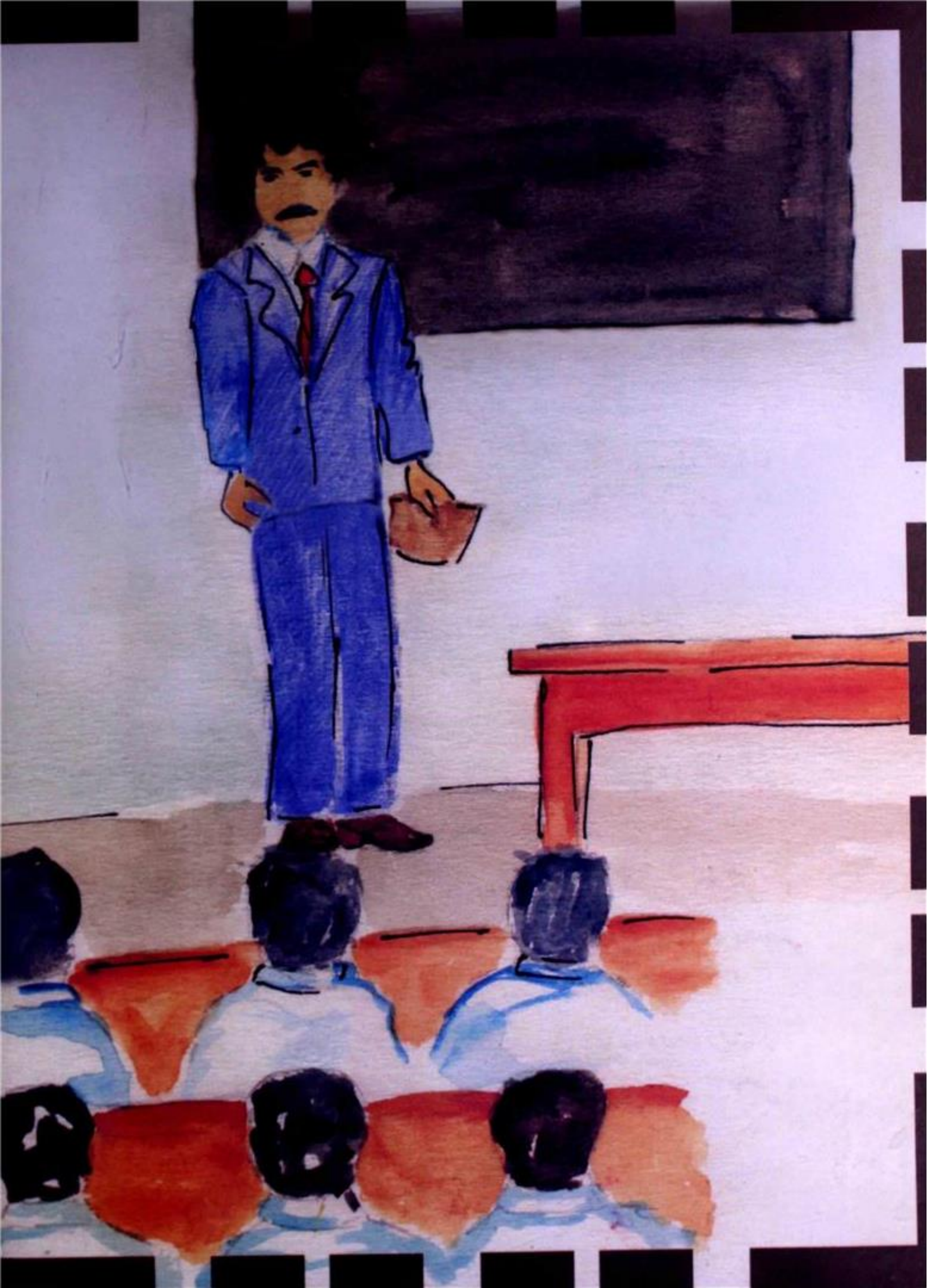

پڑھوالو، لیکن اپنے قومی شاعر کو پڑھنے کا ان کے پاس وقت ہی نہیں۔''

سارے راستے وہ بڑبڑاتے ہوئے گھر پہنچے۔ دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا اور مایوس ہوکر سو گئے۔

شام کو اٹھے تو بیگم چائے لے کر آئیں۔ وہ اسی طرح شکستہ حال بیٹھے تھے۔ بیگم نے ٹی وی کھولا اور چائے انھیں پکڑاتے ہوئے بولیں۔ ''خیریت ہے..... آج کھانا بھی نہیں کھایا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''بس کچھ نہ پوچھو بیگم..... میں تو بہت مایوس ہوگیا ہوں اس قوم سے۔''

انھوں نے چائے کی پیالی بیگم سے لی اور ساری داستان سنا ڈالی۔

''آپ کو اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام میں مایوسی گناہ ہے۔ آپ اچھی طرح سوچیں اور اپنا استعفا واپس لیں۔'' بیگم صاحبہ کو شاید مستقبل کے اندیشے بھی گھیرے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر بعد اٹھ کر کچن کی طرف چل دیں۔ نیاز صاحب ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''علامہ اقبال نے کس عنوان سے مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی؟''

''ایران میں فلسفۂ اِلٰہیات کا ارتقاء''

''جواب درست ہے۔'' ٹی وی پر اقبال کوئز ہو رہا تھا۔ میزبان مختلف یونی ورسٹیوں کے طلبہ سے سوالات کر رہا تھا۔

''علامہ نے اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ کی یاد میں کون سی نظم لکھی؟''

''نالۂ فراق'' جواب دیا گیا۔

''جواب درست ہے۔''

''علامہ اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر کب مقرر ہوئے؟''

''۳ جون ۱۹۰۳ء کو'' ایک اور صحیح جواب ملا۔ نیاز صاحب حیرت سے پروگرام دیکھ رہے تھے۔

''اتنی معلومات تو مجھے بھی اقبال کے بارے میں نہیں۔'' انھوں نے دل میں سوچا۔

''اپنی پسند کا اقبال کا ایک شعر سنائیں۔''

میزبان کی فرمائش پر ایک طالب علم نے شعر سنایا۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

ایک نوجوان کے منہ سے اقبال کا یہ شعر سن کر نیاز صاحب کا منہ کھلا رہ گیا۔

''میں تو اقبال پر مضمون نگاری کروا رہا تھا اور خود اقبال کے پیغام کو نہ سمجھ سکا۔ اقبال تو اس ویران کھیتی سے ناامید نہ ہوئے تھے پھر میں کیوں؟'' انھیں اپنی ہی آواز کہیں گہرائی سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

''اگر کچھ نوجوان اقبال کے پیغام کو سمجھ نہیں سکے تو کیا ہوا؟ ابھی اقبال کے ایسے شاہین بھی تو موجود ہیں جو اپنے قومی شاعر کو پڑھ رہے ہیں، ان کے پیغام کو سمجھ رہے ہیں۔''

انھیں اپنے فیصلے پر ندامت ہو رہی تھی کہ آخر یہ نوجوان جو اقبال کے بارے میں اتنا جانتے ہیں، ان کے اساتذہ ہی نے تو انھیں تیار کیا ہوگا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ شاید کوتاہی میری ہی ہے کہ میں اپنے شاہین بچوں کو اونچی اڑان کا سبق ہی نہ دے سکا۔

اگلے دن اسکول کا تمام اسٹاف انھیں ان کی دوبارہ واپسی پر خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

یہ ریس میرا ریس

''علم ایسی دولت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی، بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔'' حمزہ نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔''لیکن ہم علم حاصل نہیں کرتے .....ہم پورا سال کتابیں رٹ کر امتحان پاس کرتے ہیں اور پھر بڑے فخر سے لوگوں کو بتاتے پھرتے ہیں کہ ہم پاس ہوگئے۔ نہیں میرے عزیز دوستو! آپ کامیاب نہیں ہوسکے۔ آپ ناکام ہوئے ہیں۔ اگر آپ علم کو علم سمجھ کر پڑھتے تو آپ کی زندگیوں میں انقلاب آچکا ہوتا۔ اس قوم کو کتنے ہی قائداعظم اور علامہ اقبال نصیب ہو چکے ہوتے۔''

یہ آئی ٹی (انفارمیشن ٹیکنالوجی) کے حوالے سے ہونے والا سیمینار تھا۔ جس میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ماہر نوجوان حمزہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ آئی ٹی کا لفظ شاید بے شمار لوگوں کے لیے اہم ہو لیکن حمزہ کے لیے یہ لفظ بہت عام سا تھا۔ وہ مہارت کے اُس مقام تک آ پہنچا تھا جہاں تک بہت کم لوگ پہنچ پاتے ہیں۔ اُس نے واقعی علم کو علم سمجھ کر حاصل کیا تھا۔ اسی لیے آج وہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور سوفٹ ویئر کی دنیا میں اپنا نام پیدا کر چکا تھا۔

سیمینار ختم ہوا تو حمزہ اپنی کار میں بیٹھا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ کار کا سفر کچھ ہی دیر بعد ختم ہوگیا، کیوں کہ اُس کا گھر آچکا تھا۔ گھر بہت خوب صورت تھا۔ بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن حمزہ کے لیے کافی تھا۔ کیوں کہ وہ اس دنیا میں ہر قسم کے

رشتوں سے محروم تھا۔ اُس کو علم کے راستوں پر جس مہربان نے چلایا وہ بھی اب اس دُنیا میں نہیں تھا۔ لیکن اُس نے رشتوں کی محرومی اور اپنی غربت کو کبھی بھی اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دیا تھا۔ اس کی دن رات کی محنت کا صلہ اسے کامیابی کی صورت میں ملا۔ آج کمپیوٹر کی دنیا میں اُس کا ایک نام تھا۔ حمزہ اپنی کمپیوٹر لیبارٹری (تجربہ گاہ) میں پہنچ چکا تھا۔ اُس کا زیادہ تر وقت لیبارٹری میں ہی گزرتا تھا۔ اِن دنوں وہ ایک بہت اہم منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اس منصوبے پر اُس کے چار سال صَرف ہوئے تھے اور صِرف وقت ہی نہیں بلکہ اُس کی تمام جمع پونجی بھی اس میں لگ چکی تھی۔ اب اُسے اپنی محنت کا پھل ملنے والا تھا۔

حمزہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔ ''لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ میں نے اُن کے لیے کتنا بڑا اور اہم کام انجام دیا ہے۔'' حمزہ بڑبڑایا۔ اچانک فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ حمزہ نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے کسی نے انگریزی زبان میں کہا۔ ''ہیلو مسٹر حمزہ! کیسے ہیں آپ؟''

''جی ٹھیک ہوں..... معاف کیجیے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' حمزہ نے بھی انگریزی میں کہا۔

''میرا اور آپ کا یہ پہلا رابطہ ہے۔ اس لیے آپ مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔''

''جی فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' حمزہ نے پوچھا۔

''میرا نام رچرڈ ہے۔ میں امریکا میں سوفٹ ویئر بنانے والے ایک بہت بڑے ادارے کا مالک ہوں۔'' حمزہ حیران تھا۔

''میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں مسٹر رچرڈ؟''

''آپ آج کل جس منصوبے پر کام کر رہے ہیں، میں اُس پر بات کرنا چاہتا ہوں۔'' رچرڈ نامی اُس شخص کی آواز ابھری۔ حمزہ کی حیرت شدید ہوگئی۔

''آپ کو اس کے بارے میں کیسے پتا چلا؟ میں نے تو اس کے بارے میں کسی کو کچھ بتایا ہی نہیں!''

''آپ بھول رہے ہیں مسٹر حمزہ!'' رچرڈ نے کہا۔ ''گزشتہ ہفتے آپ نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ایک پروگرام میں ذکر کیا تھا۔''

حمزہ کو اچانک یاد آ گیا۔ واقعی اُس نے کامیابی کے جوش میں ہلکا سا ذکر کر دیا تھا۔ لیکن سوال پھر وہی تھا۔ امریکا میں بیٹھے ہوئے ایک شخص کو اس کے بارے میں کیسے علم ہوا۔ چناں چہ اُس نے پھر سوال کر دیا۔

''مسٹر رچرڈ! یہ درست ہے کہ میں نے اُس سیمینار میں اس منصوبے کا ذکر کیا تھا۔لیکن آپ کو اتنی دور بیٹھے ہوئے اس بات کا کیسے پتا چلا؟''

''مسٹر حمزہ! ہمارے ادارے کی شاخیں ہر ملک میں موجود ہیں۔آپ کے ملک میں بھی ہماری شاخ اور لوگ موجود ہیں۔کمپیوٹر کے حوالے سے جہاں کہیں بھی کوئی پروگرام ہوتا ہے تو وہ لوگ اُس میں شرکت کرتے ہیں اور اس حوالے سے ہونے والی پیش رفت سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں۔'' رچرڈ نے تفصیل سے بتایا۔

''اور یہی آپ کی ترقی کا راز ہے''۔حمزہ نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔''لیکن مسٹر رچرڈ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میرے منصوبے کے حوالے سے آپ کے پاس کیا معلومات ہیں؟''

''تو آپ ہماری معلومات کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔'' رچرڈ نے ہنس کر کہا۔

''چلیے ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔مسٹر حمزہ آپ کے ہاں جو عظیم شاعر ہیں۔سر علامہ اقبال۔وہ صرف آپ کے ہی نہیں پوری دنیا کے شاعر ہیں۔اُن کی شاعری عالمی شاعری ہے اور اُس میں ہر سچے آدمی، سچی قوم اور معاشرے کے لیے پیغام موجود ہے۔کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں مسٹر حمزہ؟''

''سو فیصد صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔'' حمزہ نے اعتراف کیا۔

''آپ کا منصوبہ اِنھی کے حوالے سے ہے اور ہم یہی جاننا چاہتے ہیں کہ وہ ہے کیا؟''

''مسٹر رچرڈ! آپ نے علامہ اقبال کے حوالے سے جس سچائی کا اعتراف کیا

وہ مجھے بہت پسند آئی۔ اس لیے میں آپ کو اپنے منصوبے کی تفصیل بتا دیتا ہوں۔''
حمزہ نے کہا۔ ''اقبال کی شاعری صرف ہمارے لیے ہی اہم نہیں بلکہ اس کی ضرورت دنیا کے ہر انسان کو ہے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر دنیا کی پندرہ اہم ترین زبانوں میں ان کی تمام شاعری، تشریح سمیت منتقل کر کے ایسا سوفٹ ویئر بنا دیا ہے کہ صرف ایک بٹن دبانے سے کسی دوسری زبان میں اُن کا کلام آپ کے سامنے آ جائے گا۔ پھر میں نے ان کی شاعری کو موضوع کے اعتبار سے بھی تقسیم کیا ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ آپ کو اقبال کے شعر کا اگر ایک لفظ بھی آتا ہے تو آپ اس کے ذریعے بھی مکمل شعر ڈھونڈ سکیں گے۔''

''مسٹر حمزہ! یہ تو بہت بڑا پروجیکٹ ہے! آپ نے یہ کیسے کر لیا؟'' رچرڈ نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ آپ نے چند سالوں میں کیسے کر لیا؟''

''مسٹر رچرڈ! علامہ اقبالؒ کی شاعری کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں تو ہو چکے ہیں۔ کمپیوٹر میں ابھی تک نہیں آ سکے تھے۔ اس لیے مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ جب میں نے منصوبہ شروع کیا تو میرے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ اب طالب علم کتاب سے دور اور کمپیوٹر کے قریب آتے جا رہے ہیں۔'' حمزہ نے وضاحت کی۔ ''کمپیوٹر پر ایسی چیز آ گئی تو طالب علم ایک بار پھر اُن کے کلام کو پڑھ سکیں گے بلکہ عمل کرنے کا موقع بھی ملے گا۔''

''آپ کا منصوبہ نہ صرف اہم بلکہ قیمتی بھی ہے۔ کیا قیمت لیں گے آپ اس

کی؟'' رچرڈ نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''قیمت!'' حمزہ ہنس دیا۔ ''مسٹر رچرڈ! یہ کام میں نے دولت کے لیے نہیں کیا۔ اس کو تو میں نے قومی جذبے کے تحت ایک خدمت سمجھ کر انجام دیا ہے۔''

''ہمیں آپ کے جذبے سے انکار نہیں، مسٹر حمزہ!'' رچرڈ نے کہا۔ ''لیکن لوگوں تک اسے پہنچانے کے لیے آپ اسے کسی سوفٹ ویئر کے ادارے کو تو دیں گے ہی۔''

''اس کے لیے میں کسی مقامی ادارے کو ترجیح دوں گا۔ آپ کے سوفٹ ویئر بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ وہ ہر آدمی نہیں خرید سکے گا۔ جب کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا یہ کام ہر آدمی تک پہنچے۔''

''مسٹر حمزہ! قوم کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنی خدمت بھی ضروری ہوتی ہے۔ میں آپ کو ایک پیش کش کرتا ہوں آپ پندرہ دنوں تک مجھے اس کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا بتا دیں۔''

''سوری مسٹر رچرڈ! میں آپ کی کوئی پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔'' حمزہ نے دوٹوک جواب دے دیا۔

''ابھی انکار مت کریں مسٹر حمزہ، آپ کے پاس اس کام کے لیے پورے پندرہ دن ہیں۔''

''انکار کرنے میں تو پندرہ سیکنڈ بھی نہیں لگتے۔'' حمزہ ہنس کر بولا۔

''پھر بھی آپ پیش کش تو سن لیں۔ اس سوفٹ ویئر کے لیے ہم آپ کو ایک کروڑ روپے دے سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکا کی مستقل شہریت بھی مل سکتی

ہے۔''

''شکریہ مسٹر رچرڈ!'' حمزہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔''میرے جیسے آدمی کے لیے یہ بہت بڑی قیمت ہے۔لیکن میں اس قیمت پر بھی اسے بیچنا پسند نہیں کروں گا۔''

''پندرہ دن..... پورے پندرہ دن ہیں آپ کے پاس!'' رچرڈ نے کہا۔ ''ان دنوں میں اسے اپنے ہاں بیچنے کی کوشش کیجیے۔پھر مجھے جواب دے دیجیے گا۔'' اتنا کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔

حمزہ نے بھی ریسیور رکھ دیا۔کچھ دیر تک وہ اس مسئلے پر سوچتا رہا پھر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔''بے وقوف! سمجھتا ہے کہ اس دنیا میں روپیہ ہی سب کچھ ہے۔اور امریکا کی شہریت..... اونہہ گھٹیا آدمی، گھٹیا سوچ.....'' حمزہ نے شدید حقارت بھرے لہجے میں خود کلامی کی۔''اپنا وطن چھوڑ کر میں ان کے ملک میں کیوں جاؤں۔اپنے ملک کو فائدہ کیوں نہ پہنچاؤں۔''

ملک کے اندر سوفٹ ویئر بنانے والی کمپنیاں چند ایک ہی تھیں۔اس دن کے بعد حمزہ نے اُن لوگوں سے رابطہ شروع کر دیا۔لیکن اُس وقت اس کی حیرت اور مایوسی کی انتہا نہ رہی، جب اکثر اداروں نے اُس کے منصوبے میں کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ایک دو نے دلچسپی ظاہر بھی کی تو انھوں نے یہ شرط لگائی کہ اس منصوبے میں لگانے کے لیے سرمایہ بھی وہ فراہم کرے۔اب وہ سرمایہ کہاں سے لگاتا۔اپنی جمع پونجی تو اس منصوبے کی تکمیل میں لگا چکا تھا۔اسی جدوجہد اور کشمکش میں

پندرہ دن گزر گئے۔ وہ کچھ بھی نہ کر پایا اور مسٹر رچرڈ کا فون آ گیا۔

''ہیلو مسٹر حمزہ! کچھ کامیابی ملی آپ کو۔''

''جی نہیں مسٹر رچرڈ! ابھی کوششیں جاری ہیں۔'' حمزہ نے بات بنائی۔

''یہ کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گی، مسٹر حمزہ!'' رچرڈ نے کہا۔ ''ایک بات آپ بھول گئے۔ آپ کے ملک میں سوفٹ ویئر بنانے کی جتنی بھی کمپنیاں ہیں۔ وہ ہماری ٹیکنالوجی کی محتاج ہیں۔ ہمارے اشارے کے بغیر وہ آپ سے یہ پروجیکٹ نہیں لے سکتیں۔'' اب بات حمزہ کی سمجھ میں آئی۔ اُسے مختلف کمپنیوں کی جانب سے انکار رچرڈ کے حکم پر کیا گیا تھا۔ یہ سوچ کر حمزہ کی کنپٹیاں سُلگ اٹھیں۔

''مسٹر رچرڈ! مجھ پر اس بلیک میلنگ کا کچھ اثر نہ ہوگا۔''

''اثر تو ہو گیا مسٹر حمزہ! آپ کے عالمی شاعر کی شاعری اب کمپیوٹر کی دنیا میں داخل نہیں ہو سکے گی۔''

''ہوگی..... ضرور ہوگی ان شاء اللہ۔''

''مگر کیسے..... کسی سوفٹ ویئر کمپنی کے بغیر آپ کیا کر سکیں گے؟''

''مسٹر رچرڈ! آپ خدا نہیں ہیں کہ میرے سارے راستے بند کر سکیں۔''

''تو پھر کچھ کر کے دکھایئے مسٹر حمزہ!'' رچرڈ نے طنز کیا۔

''ٹھیک ہے۔'' حمزہ نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔ ''پہلے آپ نے مجھے پندرہ دن دیے تھے۔ اب میں آپ کو پندرہ دن دیتا ہوں۔ ٹھیک پندرہ دن کے بعد میں آپ کو بتاؤں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

حمزہ کے لیے آزمائش شروع ہو چکی تھی۔ وہ مایوس ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ پوری رات میں اُس نے منصوبہ بندی کر لی کہ اُسے اب کرنا کیا ہے۔ مسئلے کا حل اسے صرف یہی نظر آتا تھا کہ وہ اپنی سوفٹ ویئر کمپنی بنا لے۔ رہا سوال سرمائے کا، تو اس کا حل بھی اُس کے پاس تھا۔ اگلی صبح وہ تیار ہو کر ایک ایسے صنعت کار کی طرف چل دیا جس کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ وطن سے محبت کرنے والا آدمی ہے۔ دو تین سیمیناروں میں وہ مہمانِ خصوصی کے طور پر حمزہ کو ایوارڈ اور انعام بھی دے چکا تھا۔

صنعت کار زاہد شاہ اپنی فیکٹری کے دفتر میں موجود تھا۔ حمزہ کو دیکھتے ہی شناسائی کی ایک چمک اُس کی آنکھوں میں ابھری اور وہ گرم جوشی سے اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''حمزہ بیٹے! آپ..... یہاں!''

''السلام علیکم، شاہ صاحب.....'' حمزہ نے آگے بڑھ کر اُس سے ہاتھ ملایا۔

''وعلیکم السلام، بیٹے.....تشریف رکھیں۔''

زاہد شاہ نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ زاہد شاہ کے اتنے پرتپاک استقبال پر حمزہ کو دلی اطمینان حاصل ہوا۔ اسے یقین ہو گیا کہ زاہد شاہ ضرور اس کے کام آئے گا۔ زاہد شاہ نے فوراً اُس کے لیے چائے منگوالی تھی۔ چائے پینے کے دوران حمزہ نے اپنا سارا مسئلہ اُس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ پوری بات سن کر زاہد شاہ کی بھی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''بہت کمینے لوگ ہیں یہ پیسے کے بغیر اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن بیٹے آپ فکر نہ کریں۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''شاہ صاحب! اس میں کافی سرمایہ لگتا ہے۔'' حمزہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''حمزہ بیٹے! سرمایہ تو اللہ کی مہربانی سے بہت ہے میرے پاس۔ اس کی تو تم فکر نہ کرو۔ لیکن میں اپنے ساتھ کچھ دوسرے لوگوں کا پیسا بھی شامل کرواؤں گا۔''

''وہ کس لیے سر؟'' بات حمزہ کی سمجھ میں نہیں آئی۔

''پیسا اُن کے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ بس اس طرح کی سرگرمیوں سے اُن کے دلوں میں وطن کی محبت تازہ رہتی ہے۔''

''ٹھیک ہے سر! جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' حمزہ نے کہا۔

''اچھا، سمجھو پیسا تمھیں مل گیا، کمپنی بھی بن گئی، سوفٹ ویئر کے لیے فنی و تکنیکی تعاون کہاں سے حاصل کرو گے۔'' زاہد شاہ نے پوچھا۔

''شاہ صاحب، اس کے لیے اپنا دوست ملک چین موجود ہے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے..... سمجھو ابھی سے کام شروع..... تم چین کے لیے کل ہی نکل جاؤ..... اللہ تمھاری مدد کرے گا۔''

اس کے بعد کا پورا ہفتہ حمزہ نے چین میں مختلف اداروں کے سربراہوں اور کمپیوٹر کے پیشے کے ماہرین سے ملاقات میں گزارے۔ جب وہ لوٹا تو اس کی کمپنی کا شان دار دفتر بن چکا تھا۔ بعد کے دنوں میں ''پاکستان سوفٹ ویئر ہاؤس'' کے نام سے کمپنی وجود میں آ چکی تھی۔ ٹھیک پندرھویں دن کلامِ اقبال کا بہترین سوفٹ ویئر

PAKISTAN
SOFTWARE
HOUSE

تیار ہو کر مارکیٹ میں آ چکا تھا۔ رات کے وقت رچرڈ کا فون آ گیا۔ اُسے بھی اطلاع مل چکی تھی۔

''مسٹر حمزہ! میں شدید حیران ہوں۔ اتنے کم وقت میں تم نے اتنا بڑا کام کیسے کر لیا؟''

''یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور مدد سے ممکن ہو سکا ہے۔ لیکن میں اس کے لیے تمھارا بھی شکر گزار ہوں مسٹر رچرڈ۔''

''میرا.....! میرے شکر گزار کس لیے؟ میں نے تو تم سے کسی قسم کا تعاون نہیں کیا۔'' رچرڈ حیرانی کے ساتھ بولا۔

''اسی بات کا تو شکریہ ادا کر رہا ہوں کہ آپ نے میری مدد نہیں کی، اُسی کے نتیجے میں تو آج میں اپنا ادارہ بنانے میں کامیاب ہوا ہوں۔''

''اوہ ہاں! یہ تو واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔'' رچرڈ نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔ ''اب تم سستے سوفٹ ویئر لا کر میری کمپنی کے مقابلے میں آیا کرو گے۔''

''مسٹر رچرڈ! میری ایک بات ہمیشہ کے لیے اپنی گرہ میں باندھ لیں۔ مسلمانوں کی یہ فطرت ہے کہ جب اُس کے راستے بند کر دیے جائیں تو وہ اپنی راہیں خود تلاش کرتا ہے۔ تم لوگوں نے ایٹمی ٹیکنالوجی پر پابندی لگائی، ہم نے ایٹم بم خود تیار کر لیا۔ تم نے میزائل ٹیکنالوجی دینے سے انکار کیا۔ اب ہمارے پاس جدید ترین میزائل موجود ہیں۔ ہمارے لیے تو یہی بہتر ہے کہ تم ہمیں کچھ بھی نہ دو تا کہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ تم لوگ دوستی کے نام پر ہمارے ملک کو تباہ کرتے جا رہے ہو۔ لیکن یاد رکھو۔ مسٹر رچرڈ! ابھی ہم میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو اس وطن کو ایک مضبوط ملک بنانے کے لیے دن رات کام کر رہے ہیں۔''

حمزہ کی باتیں سن کر رچرڈ خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ باقی نہ تھا۔

اسرارِ خودی

قیمتی کار رُک گئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔ ایک باوقار آدمی کار سے برآمد ہوا۔ ایک ہاتھ میں بیساکھی لیے فرش پر ٹیکتا ہوا وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ بشیرا قیمتی کار دیکھ کر دوڑتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ شیشے صاف کرنے کے بہانے بھیک بٹورنے آدھمکا تھا۔ مگر کار سے اترنے والے شخص کو دیکھ کر وہ جیسے زمین میں گڑ گیا۔ گویا کوئی پتھر کا مجسمہ ہو۔ اترنے والی باوقار شخصیت کو وہ پہچان گیا تھا۔ وہ دس سال پیچھے ماضی میں جھانکنے پر مجبور ہو گیا۔

وہ ایک یتیم خانہ تھا۔ جو یتیم خانہ کم اور کسی وڈیرے کا بیگار کیمپ زیادہ تھا۔ وہاں پر ظلم کی چکی میں پسنے والے مظلوم بچے تھے جن میں وہ دونوں بھی شامل تھے۔ کمالا اور بشیرا

جن کی عمریں ۱۳، ۱۴ سال کی تھیں۔ پھر ایک دن وہ دونوں یتیم خانے سے بھاگ نکلے۔ آخر کب تک ظلم وستم کی چکی میں پستے اور الٹا ظلم کرنے والے داد سمیٹ رہے تھے۔ یتیموں کے لیے آنے والا سامان ان کے گھروں میں منتقل ہو رہا تھا۔ اور ان بے چاروں کو تینوں وقت ریت ملی دال اور ادھ پکے چاول کھانے پڑتے تھے۔ ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے اس جیل خانے میں آئے تھے۔ جب سے شعور کی دنیا میں آئے یہیں پر خود کو پایا۔ ان دونوں میں بھائیوں جیسی محبت اور پیار تھا۔ یتیم خانے کے رجسٹر میں ان کے نام کمال احمد اور بشیر احمد درج تھے۔ لیکن ان دونوں کو کمالا اور بشیرا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ دونوں کو ایک ساتھ چندہ جمع کرنے بھیج دیا جاتا۔ انھوں نے چندے کی رقم میں سے پیسے اڑانے شروع کر دیے۔

پھر ایک دن ان کی چوری پکڑی گئی۔ خوب مار پڑی۔ اس دن انھیں کھانا بھی نہ ملا۔ بھوک اور بے عزتی نے ان کو ایک نئی راہ سُجھا دی۔ دونوں نے یتیم خانہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ رات کو اپنے بچائے ہوئے پیسے نکالے اور صبح جب ''کام'' پر نکلے تو سیدھے ریلوے اسٹیشن چلے گئے۔ گاڑی میں بیٹھے اور دوسرے شہر میں جا کر ہی دم لیا۔

دوسرے شہر میں رہنے کے لیے اسٹیشن ہی کو منتخب کیا۔ اور کام وہی پرانا یعنی بھیک۔ ہفتے کے بعد ان کے کپڑے مزید میلے ہو گئے اور وہ بھیک کے نت نئے انداز بھی سیکھ گئے۔ اب صبح اور شام کے وقت بھیک مانگتے تھے جب کہ باقی دن میں آرام کیا کرتے تھے۔

ایک دن دونوں بازار میں تھے۔ بشیرے نے بازار کی سڑک پار کی۔ جب کمالا پار

کرنے لگا تو ایک تیز رفتار گاڑی کی لپیٹ میں آ گیا۔ درد کی ایک تیز لہر نے اسے بے ہوش ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر جب کمالے کی آنکھ کھلی تو وہ سرکاری ہسپتال میں تھا۔ بشیرا اس کے سرہانے رونی صورت بنائے کھڑا تھا۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ کمالے پر جھک کر بولا۔

''کمالے تو ہوش میں آ گیا۔ تو ٹھیک تو ہے نا۔'' کمالے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹروں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ یہ دونوں اکیلے ہیں اور آگے پیچھے کوئی نہیں ہے تو ان کی توجہ بھی کم ہو گئی۔ تین دن تک کمالا درد کے مارے تڑپتا رہا۔ ایک خدا ترس ڈاکٹر کو ترس آیا اور کمالے کا معائنہ کر کے یہ تجویز کیا کہ پیر کاٹنا پڑے گا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر خوب روئے۔ دوسرے دن کمالے کی ٹانگ کاٹ دی گئی۔ چند دنوں کے بعد بیساکھی کے سہارے کمالا بشیرے کے ساتھ پرانے ٹھکانے پر چلا آیا۔

کمالا اور بشیرا دونوں اپنے معمول پر آ گئے۔ کمالے کو اب زیادہ بھیک ملنے لگی۔ ایک دن بشیرے نے کہا۔

''کمالے تو خوش قسمت ہے کہ ٹانگ کٹ گئی۔ دیکھو نا! لوگ مجھے ہٹا کٹا کہتے ہیں کہ بھیک کیوں مانگتا ہے۔ مگر تجھے دیکھ کر ترس کھاتے ہیں اور خوشی سے بھیک دیتے ہیں۔'' کمالے نے زخمی مسکراہٹ سے اس کو جواب دیا۔

''ہاں بشیرے بھیک تو زیادہ ملتی ہے مگر ہم الگ تھوڑی ہیں۔ مجھے زیادہ بھیک ملے گی تو کس کے پیسے ہیں ہم دونوں کے ناں۔'' اور بشیرا کھسیانا ہو کر مسکرانے لگا۔ اس بات کو تین ماہ گزر گئے۔ ایک دن کمالے نے بشیرے کے سامنے دھماکا خیز اعلان کر دیا۔

''بشیرا اب میں بھیک نہیں مانگوں گا۔''

''کیا! کیوں نواب بن گئے ہو؟ کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے کیا؟''

''ہاں بشیرے میں اب محنت مزدوری کروں گا۔ ہم کب تک بھیک مانگیں گے اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلائیں گے۔'' کمالے نے افسردہ مگر مضبوط لہجے میں کہا۔

''ارے یہ مزے ہم کیسے چھوڑ دیں۔ بغیر ہاتھ پیر ہلائے مل رہا ہے تو کیا اب مزدوری کریں گے۔ نہیں کمالے یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''اچھا تو پھر میں مزدوری کروں گا اور پانچ دس کما کر گزارہ کرلوں گا۔'' کمالے کی بات بہت اچھی تھی مگر بشیرا نہ مانا۔ یوں دونوں ایک دوسرے کو قائل کیے بغیر سونے کی تیاری کرنے لگے۔

دوسرے دن بشیرے نے دیکھا کہ کمالا برش اور پالش خرید لایا اور ایک پھل کے خالی ڈبے میں سامان ڈال کر اسٹیشن کے باہر ہی بوٹ پالش کرنے لگا۔ بشیرا اور کمالا ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ اب بشیرا کبھی کبھی کمالے پر طنز بھی کرنے لگا۔ ایک دن کمالا اپنے سامان سمیت اسٹیشن کے آگے سے غائب ہوگیا۔ اور بشیرا باوجود کوشش کے اُسے نہیں ڈھونڈ سکا تھا۔

ہارن کی آواز سن کر بشیرا جیسے نیند سے جاگ اٹھا۔ وہ ماضی کے دھندلکوں سے دوبارہ پلٹ آیا۔ قیمتی کار اسٹارٹ ہوگئی۔ وہ ابھی تک کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، چوکنا ہوگیا اور ایک طرف ہونے کا ارادہ کرلیا کہ کار والے نے دروازہ کھولا اور بیساکھی ٹیکتا ہوا اس کی طرف

بڑھا۔اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہوگئی۔وہ بیساکھی کے سہارے بشیرے کے قریب آیا اور کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔''بشیرے!'' بشیرا گھبرا کر پیچھے ہٹا۔کار والے نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''بشیرے! میرے دوست۔چل آجا میرے ساتھ میرے گھر چل۔آجا آجا۔''

کار والا اسے کھینچتا ہوا کار کی طرف لے جا رہا تھا۔خود لاٹھی ٹیک رہا تھا۔مگر بشیرے کو یوں لگ رہا تھا۔جیسے معذور شخص اسے سہارا دے رہا ہو۔وہ دونوں کار میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔پچھلی سیٹ پر کار والے نے بشیرے کو یوں پکڑا تھا جیسے وہ ابھی بھاگ جائے گا۔

بشیرا ڈرائنگ روم میں نہایت مرعوبانہ انداز میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔اس کے آگے کمالا بیٹھا تھا۔چائے ملازم لے کر آیا تھا۔اتنے میں ایک خوب صورت چار سالہ بچی بھی ڈرائنگ روم میں آئی۔ڈیڈی کہہ کر کمالے کی گود میں بیٹھ گئی۔اور حیرت سے بشیرے کو دیکھنے لگی۔

''بیٹا! یہ تمھارے انکل ہیں بشیر احمد۔'' کمالے نے گویا تعارف کرایا۔

''سلام انکل!'' بچی نے سلام کیا تو بشیرے کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔اچھا بشیر تم پوچھو گے نہیں یہ سب کچھ کیا ہے۔'' کمالے نے گویا گفتگو کا آغاز کیا۔

''میں حیران ہوں، سخت حیران۔'' بشیرے نے کہا۔''یہ سب کیسے ہوا؟''

''یہ اقبال کا کمال ہے۔'' کمالے نے کہا۔

''کیا اقبال کوئی سخی داتا تھا جو مرتے ہوئے یہ سب کچھ تمھارے حوالے کر گیا۔''

''نہیں، اقبال تو ہمارے قومی شاعر ہیں۔علامہ ڈاکٹر محمد اقبال۔میں اُن کی

بات کر رہا ہوں۔'' کمالے نے گویا تصحیح کی۔

''اچھا وہ اقبال! مگر وہ تو پاکستان بننے سے پہلے وفات پا چکا تھا۔'' بشیرے نے گویا اپنی سی معلومات کا استعمال کیا۔

''ہاں ہاں وہی اقبال۔ میں شروع سے بات بتاتا ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم بھیک مانگا کرتے تھے۔ مگر ایک بات واضح کر دوں تم نے ابھی جو کہا کہ اقبال وفات پا چکا ہے تو سمجھو کہ ایسے لوگ مرتے نہیں۔'' کمالے نے کہا تو بشیرے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔

''اس دن بھی میں بیساکھی ٹیکتا ہوا بھیک مانگ رہا تھا۔ وہاں اسٹیشن کے قریب ایک اسکول تھا۔ وہ ۹ نومبر کا دن تھا۔ اسکول میں تقریب تھی۔ علامہ اقبال کے یومِ پیدائش کے سلسلے میں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ اس دن میں وہاں گہما گہمی دیکھ کر زیادہ بھیک کے آسرے میں گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کسی بڑے صاحب کی سال گرہ ہے جو اسکول میں منائی جا رہی ہے۔ اس لیے میں وہاں رکا۔ جلد ہی یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ تو شاعر علامہ اقبال کی یومِ پیدائش کی تقریب ہے۔ مقررین نے تقریریں کیں اور اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ میں نے کچھ سنا کچھ نہیں سنا۔ مگر ایک شعر میرے ضمیر میں کسی خنجر کی طرح پیوست ہوا ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ شعر سن کر مجھے یوں لگا جیسے بھیک مانگنے کو میں اپنی تقدیر بنا رہا ہوں۔ مگر ضمیر

نے کہا یہ تقدیر مجھے قبول نہیں ہے اور مجھے تقدیر بنانا ہوگی۔ یہ سب سوچ کر میں واپس آیا اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں بھیک نہیں مانگوں گا..... میں نے بوٹ پالش شروع کر دی۔ لوگ ترس کھا کر مجھے زیادہ پیسے دیتے تھے مگر میں صاف انکار کر دیا کرتا تھا اور صرف اپنا حق وصول کرتا تھا۔ پھر جب تم نے مجھ سے اپنا تعلق ختم کر دیا تو وہ جگہ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگی۔ میں نے بہتر جگہ دیکھ کر وہاں کام شروع کر دیا۔ اچھی پالش اور اچھے اندازِ گفتگو سے میرے گاہکوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ میرے کام میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ اب میں نے دو کاری گر بھی رکھ لیے۔ میرے دن پھرنے لگے۔ کرائے کا ایک کمرہ لیا اور بچت شروع کی۔ چھ سال کے بعد میرے پاس اپنا گھر تھا۔ دکان تھی۔ ایک غریب لڑکی سے شادی کی اور آج اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ بچی ہے، گھر ہے، گاڑی ہے، صدر میں اپنی جوتوں کی دکان ہے جو بہت مشہور ہے اور اب جوتے بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی بنا رہا ہوں۔ یہ سب اللہ کا فضل اور اقبال کی مہربانی ہے۔

بشیرا سن رہا تھا۔ کمالا بول رہا تھا۔ بشیرا جو دس سال سے بھیک پر گزارا کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سامنے خودی کا پہاڑ دیکھ لیا، جس سے تقدیر بھی سر ٹکرا کر ہار گئی تھی۔ وہ اٹھا۔ کمالے کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر سیدھا کھڑا ہوا اور بولا ''کمال احمد! تو نے تو کمال کر دیا۔ تمھیں اقبال کے ایک شعر نے دس سال پہلے جو خودی کا راستہ دکھایا تھا، آج دس سال بعد تم نے مجھے وہ راستہ دکھا دیا۔ میں جا رہا ہوں۔ مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں آؤں گا، ضرور آؤں گا مگر خودی کو بلند کر کے آؤں گا۔ تب میں تم سے نظریں ملا سکوں گا۔'' بشیرا ڈرائنگ روم سے نکلا تو کمالے کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ خوشی کے آنسو، یہ آنسو اس نے بشیرے کی آنکھوں میں بھی دیکھے تھے۔ وہ آنسو جو خودی کی پہچان کے نتیجے میں بشیرے کے رخساروں پر جاری ہوئے تھے۔

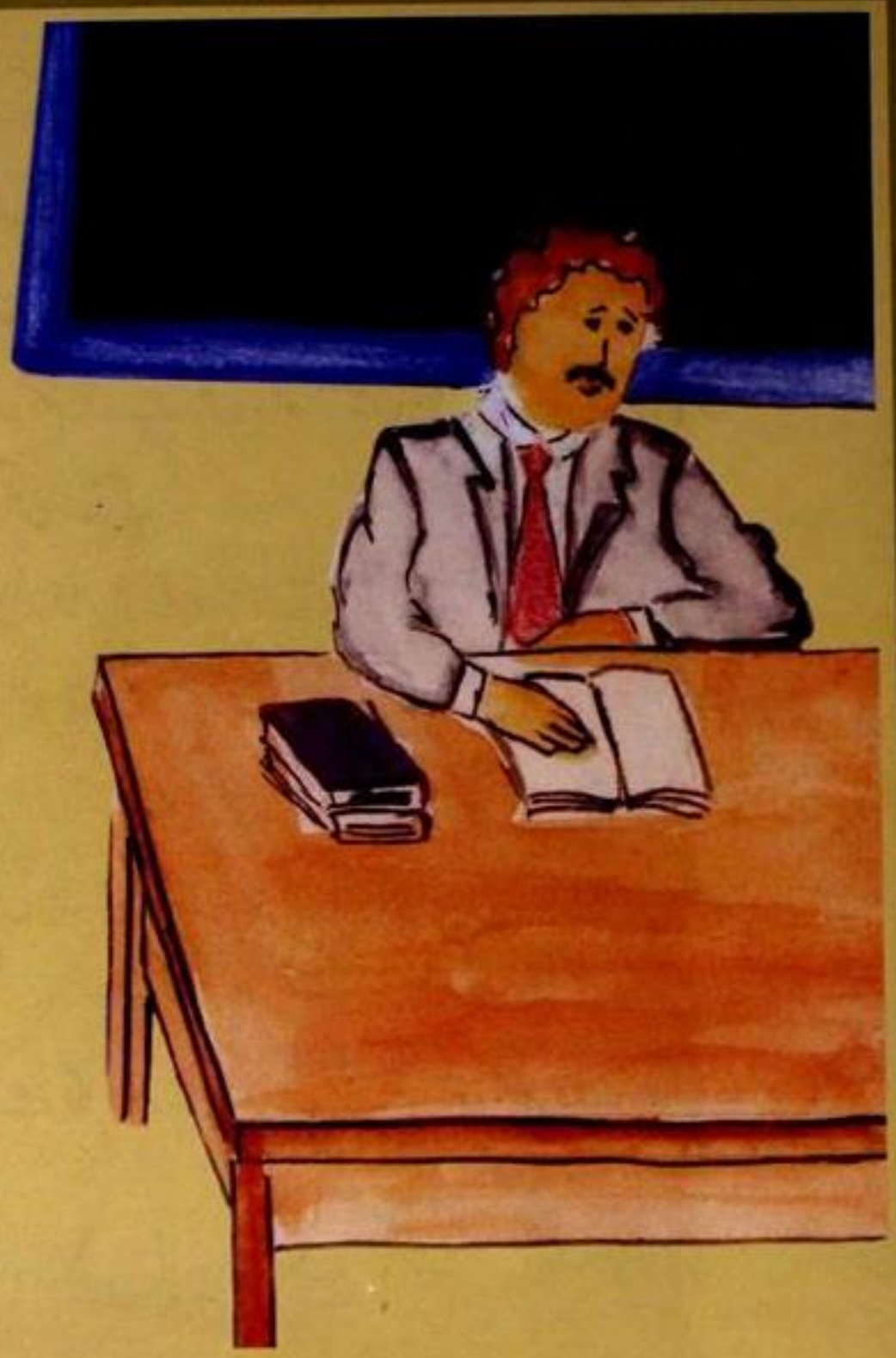

بھٹکا ہوا سورج

''ماسٹر جی! یہ درخواست تو ہم پانچ مرتبہ لکھ چکے ہیں۔'' ناصر نے کہا۔

''بھئی چھٹی بار لکھو تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔'' میں نے جواب دیا۔

میرا یہ اردو کا پیریڈ آٹھویں جماعت میں تھا اور میں بچوں کو فیس معافی کی درخواست کاپیوں میں لکھنے کو کہہ رہا تھا۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا تھا کہ آج نسیم حجازی کا ناول یوسف بن تاشفین اسکول کی لائبریری سے جاری کروایا تھا اور اس وقت وہی

ناول پڑھ رہا تھا اس لیے بچوں کو مصروف رکھنے کے لیے ایک ہی کام بار بار کروا رہا تھا۔

''عاقل! تم اٹھو اور سبق پڑھنا شروع کرو۔'' میں نے کہا۔

''ماسٹر جی! کتاب تو تین دفعہ ختم کر چکے ہیں، مگر مشقیں ساری کی ساری باقی ہیں۔ سر! مشقیں حل کروا دیں۔'' عاقل نے کہا

''دیکھو عاقل! اپنی پڑھائی کی رفتار تیز کرو۔ دس دفعہ کتاب ختم نہیں ہو گی تب تک آپ لوگوں کی پڑھنے کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی۔'' میں نے عاقل اور دوسرے بچوں کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ حالاں کہ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ کس بچے کو پڑھنا آتا ہے اور کس کو نہیں۔ بس مجھے اس جماعت میں عاقل اور جاوید کے بارے میں معلوم تھا کہ یہ پڑھتے صحیح ہیں۔

عاقل اٹھ کر کتاب تیز تیز پڑھنے لگا اور میں ناول پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر بعد عاقل نے کہا۔

''ماسٹر جی سبق پڑھ لیا ہے۔''

''اچھا، جاوید اب تم پڑھو۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے جاوید سے کہا۔

''ماسٹر جی! یہ والا سبق پڑھوں یا آگے والا۔'' جاوید نے سوال کیا۔

''آگے پڑھو بھئی آگے۔'' میں نے ناول سے نظریں ہٹائے بغیر جاوید کو حکم دیا۔ جاوید فرفر سبق پڑھنے میں مصروف ہو گیا اور میں ناول پڑھنے میں۔ اتنے میں پیریڈ تبدیل ہونے کی گھنٹی بج گئی اور میں جماعت کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اگلے دن جماعت میں داخل ہوتے ہی میں بچوں سے مخاطب ہوا۔

''پیارے بچو! آج ہم پڑھائی لکھائی کے علاوہ کچھ باتیں کریں گے۔ تو

بچو! بڑوں کا احترام کرو چھوٹوں سے پیار اور محبت سے پیش آؤ۔ اساتذہ اور
بزرگوں کی ہر بات اور حکم مانو اور خوب دل لگا کر پڑھو تا کہ تم بڑے ہو کر ڈاکٹر،

انجینیر، سائنس دان یا بڑے افسر بن جاؤ اور اس عظیم اور پاک وطن کی خدمت کر سکو۔''

میں اپنی تقریر جاری رکھے ہوئے تھا کہ پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔

''ماسٹر جی نے پڑھایا کیا ہے جو ملک وقوم کی خدمت کے لیے کہہ رہے ہیں۔'' ایک بچے نے اپنے ساتھ والے ہم جماعت سے نہایت چپکے سے کہا مگر میں نے سن لیا اور اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میز پر سے کتاب اٹھائی اور باہر کی راہ لی۔

☆☆☆☆

سالانہ امتحان کے اردو کے پرچے میرے سامنے پڑے تھے اور میں ایک ایک پرچے کو چیک کر رہا تھا کہ ایک بچے کے تیس صفحات پر مشتمل پرچے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے پرچے کو میں غور سے پڑھنے لگا۔ دوسرے صفحے سے علامہ اقبال پر مضمون شروع ہوا تھا۔ میں مضمون کو پڑھنے لگا۔ بچے نے علامہ اقبال کی پیدائش، ان کی تعلیم وغیرہ کو بالکل چھوا تک نہیں تھا۔ بلکہ اس نے لکھا تھا:

''اے روحِ اقبال! ہم آپ سے شرمندہ ہیں وہ خواب جو آپ نے دیکھا تھا وہ پورا تو ہو گیا، مگر وہ مقصد جس کے لیے ہمارے بزرگوں نے قربانیاں دی تھیں ابھی تک نامکمل ہے۔ میں بڑا افسر بننا چاہتا ہوں آپ کی طرح عزت دار اور تعلیم یافتہ بننا میری بڑی خواہش ہے۔ آپ کو تو میر حسن صاحب اور سر آرنلڈ جیسے شفیق مہربان اور قابل ترین اساتذہ مل گئے اور آپ نے اپنے نام کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ کا نام

بھی روشن کیا اور شاعری کے ذریعے اپنے ملک وقوم کو سرخرو کیا مگر ..... مگر ..... اے میرے محسن! میں اللہ سے آپ کے استادوں جیسا استاد چاہتا ہوں۔ میرے لیے دعا کریں کہ میں بھی ایک قابل اور محنتی استاد کا شاگرد بن جاؤں تاکہ میں بھی آپ کی طرح عظیم اور قابل انسان بن سکوں۔ آپ نے سچ ہی تو کہا تھا ؎

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو

اگر سورج بھٹک جائے یعنی اپنی روشنی کا صحیح عکس نہ ڈال سکے تو بدخشاں کے لعل (قیمتی پتھر) کی تربیت بھی وہ نہیں کرسکتا۔ یعنی کہ اگر استاد طالب علموں کو علم کی صحیح اور سچی روشنی نہ دے تو لائق سے لائق طالب علم بھی راہِ راست سے بھٹک جائے گا۔''

میری آنکھیں کھولنے کے لیے علامہ اقبال کے عنوان سے لکھا گیا بچے کا یہ مضمون کافی تھا۔ یقیناً استاد جہالت اور لاعلمی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں چمکتے ہوئے سورج کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے اپنی اس اہمیت کا احساس آج اچانک ہوا۔ مگر ایسے سورج کا کیا فائدہ جس کی کرنیں تاریکیوں کو اجالوں میں بدلنے کا فریضہ ہی انجام نہ دیں۔

اگلے دن جب میں اپنی کلاس میں داخل ہوا تو میرے ہاتھ میں نسیم حجازی کا ناول یوسف بن تاشفین ہی تھا مگر میں اکیلا یہ کتاب نہیں پڑھ رہا تھا بلکہ پوری کلاس اس کے اجتماعی مطالعے میں مصروف تھی۔

سلطان مراد اور معمار کی کہانی

ہمارے برادر اسلامی ملک ترکی میں کبھی عثمانی خاندان کی حکومت تھی۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ کا نام سلطان مراد تھا۔ وہ ۷۶۰ ہجری مطابق ۱۳۵۹ عیسوی میں تخت پر بیٹھا۔ اس بادشاہ نے کافروں سے جنگیں لڑکر ترکی کے علاقے میں اضافہ کیا۔ اس کی شہادت کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ کفار کے ساتھ ایک لڑائی میں اس کی فوجیں دشمن پر غالب آگئیں۔ یہ ایک ٹیلے پر کھڑا نظارہ کر رہا تھا کہ دشمن کے ایک زخمی سپاہی کی نظر اس پر پڑی۔ وہ گرتا پڑتا اس کی طرف بڑھا۔ سلطان مراد بے خبر کھڑا تھا۔ اس کافر نے وہاں پہنچ کر اچانک اسے تلوار سے شہید کر دیا۔ یہ واقعہ ۷۹۱ ہجری ۱۳۸۹ عیسوی میں پیش آیا۔ سلطان مراد کو عمارتیں خاص طور پر مسجدیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔

کبھی ایک ملک تھا جسے ماوراء النہر کہتے تھے۔ اس میں کئی ایک شہر آباد تھے۔ ان میں سمرقند، بخارا، ترمذ اور خجند وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اب یہ علاقہ جمہوریہ ازبکستان کا ایک حِصّہ ہے۔ ایک دفعہ سلطان مراد نے

ایک عالی شان مسجد بنوانا چاہی۔اس کے لیے اس نے دُور دُور سے ماہرینِ تعمیرات بلوائے۔ان میں سے ایک معمار اِسی ماوراءالنہر کے ایک شہر خجند کا باشندہ تھا وہ اپنے کام میں بلا کا ماہر تھا ۔ بادشاہ نے مسجد کی تعمیر کے لیے اُسے چن لیا اور اس سے کہا کہ فلاں جگہ ایک ایسی شان دار مسجد بنادو جسے دیکھ کر لوگ اش اش کر اٹھیں ۔اس نے سر جھکا کر کہا جناب میں اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کروں گا کہ مسجد آپ کی مرضی کے مطابق تعمیر کروں ۔ بادشاہ نے اسے تعمیر کا سارا ساز وسامان اس جگہ پر مہیا کر دیا۔

خجند کا یہ معمار اللہ کا نام لے کر مسجد کی تعمیر میں مصروف ہو گیا۔ مسجد تعمیر ہونے میں ایک عرصہ لگ گیا۔ جب مسجد پوری طرح تیار ہو گئی تو معمار نے بادشاہ کو اطلاع دی ۔سلطان مُراد خوشی خوشی اُس جگہ پہنچا۔اگر چہ معمار نے وہ مسجد بڑی محنت اور دل لگا کر بنائی تھی اور اپنی ساری مہارت اس پر خرچ کر ڈالی تھی ،لیکن خدا جانے سلطان مراد مسجد کی عمارت کس قسم کی بنوانا چاہتا تھا۔اسے تو وہ عمارت ذرا بھی پسند نہ آئی۔ جس کے سبب اسے معمار پر بڑا غصہ آیا۔ سلطان مراد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ حکم دے دیا کہ اس معمار کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔اسی وقت بے چارے معمار کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اِدھر ہاتھ کٹا، اُدھر اس کی کلائی سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔معمار بھی نڈر اور دلیر انسان تھا۔اس نے سوچا کہ یہ میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔اگر اس کے خلاف دعویٰ نہ کیا گیا تو آئندہ میرے دوسرے بھائیوں کے ساتھ بھی اسی قسم کی ناانصافی ہوگی۔ چناں چہ وہ قاضی کی عدالت تک پہنچ گیا۔معمار عدالت پہنچا تو اتفاق سے قاضی صاحب فارغ تھے۔

اس نے کہا:

''جنابِ عالی! آپ شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر سختی سے کاربند ہیں اور اس کے محافظ ہیں۔ میں آپ کی عدالت میں فریاد لے کر آیا ہوں۔ میں کسی حاکم کا ذاتی غلام نہیں ہوں۔ محنت کر کے حلال کی روزی کماتا ہوں پھر میرے ساتھ بلاوجہ کا ظلم کیوں؟ بادشاہ نے میرا یہ ہاتھ کٹوا دیا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مہربانی فرما کر قرآن کریم کی رُو سے اس ناانصافی کا فیصلہ کریں۔'' قاضی نے جو اس بدنصیب کا کٹا ہوا ہاتھ دیکھا اور اس کے ہاتھ کٹنے کی وجہ معلوم ہوئی تو انھیں بڑا دکھ ہوا۔ قاضی بڑے عدل و انصاف والے تھے اور عدل و انصاف کرنے والا سوائے اللہ کے دنیا کی کسی بھی طاقت سے خوف نہیں کھاتا۔ قاضی نے اسی وقت سلطان مراد کو اپنی عدالت میں طلب کر لیا۔ سلطان کو جب قاضی کا حکم پہنچا اور اسے معلوم ہو گیا کہ اب تو فیصلہ قرآن کی رُو سے ہو گا تو اس کے تو جیسے ہوش اڑ گئے۔ چار و ناچار قاضی کی عدالت میں پہنچا۔ قاضی نے کہا:

''اس وقت آپ یہاں مجرم کی حیثیت سے آئے ہیں۔ لہٰذا مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں۔'' سلطان مراد وہاں کھڑا ہو گیا۔ ندامت کی وجہ سے اس نے سر جھکایا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے بدن میں لہو نہیں رہا۔ یہ بھی ایک عجیب اور حیران کن منظر تھا کہ ایک طرف تو ملک کا حکمران مجرم کے طور پر کھڑا تھا اور دوسری طرف رعایا کا ایک عام آدمی فریادی کی صورت میں گردن اٹھائے قاضی کے فیصلے کا منتظر تھا۔ اسلام کی یہی وہ شاندار روایت ہے جو کسی اور مذہب میں دیکھنے

میں نہیں آتی۔

سلطان مراد نے جلد ہی معافی مانگتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی اس حرکت پر سخت شرمندہ ہوں۔ میں اپنے بچاؤ کے لیے کوئی دلیل اور بہانہ پیش نہیں کروں گا۔ یہ جرم میں نے کیا ہے۔'' قاضی نے سلطان کے اس جرم کے اعتراف کے بعد ایک قرآنی آیت پڑھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ اے عقل مند لوگو! قصاص ہی میں تمہاری زندگی ہے۔ یعنی خون کے بدلے خون اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ ہی سے تمھارا معاشرہ ایک پُر امن معاشرہ بن سکتا ہے۔ جو کوئی کسی کا ہاتھ کاٹے، بدلے میں اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ قاضی نے یہ بتا کر کہا کہ شریعت کی رُو سے ایک عام مسلمان یا ایک غلام اور آزاد آدمی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لیے بادشاہ کا خون معمار کے خون سے زیادہ قیمتی نہیں۔

سلطان مراد غصے میں ایک غلطی تو کر بیٹھا تھا لیکن تھا تو مسلمان اس نے جو قرآنی آیت سنی تو اسی وقت اپنا بازو آگے پھیلا دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ معمار کے ہاتھ کے

بدلے میں اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ مسلمان کس قدر رحم دل ہوتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ معمار نے جب بادشاہ کو یوں ہاتھ پھیلائے دیکھا تو وہ تڑپ اٹھا۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے فوراً قرآن مجید کی ایک دوسری آیت پڑھی۔ جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں انصاف اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیتا ہے۔ آیت پڑھنے کے بعد اس نے کہا سلطان کو خدا کے نام پر معاف کرتا ہوں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اس کے اس جرم کو نظر انداز کرتا ہوں۔ ایک عام آدمی نے حاکمِ وقت کو معاف کر دیا۔ یہ سب کچھ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعتِ مبارکہ کے طفیل ہی ممکن ہوا۔ بہر حال سلطان کو واپس جانے کی اجازت مل گئی۔

ٹیک جو راہ ہو

''علامہ اقبال'' ایک عظیم فلسفی شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ درجے کے مفکر اور مصلحِ قوم بھی تھے۔ اقبالؒ کی ادبی شخصیت عالم گیر ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے ملک وقوم کو بیدار کیا۔ انھوں نے نہ صرف بڑوں کے لیے شاعری کی بلکہ بچوں کے لیے اچھی اچھی اصلاحی نظمیں لکھ کر اپنے آپ کو بچوں کا اقبال بھی منوایا۔ اُن کی زندگی ہی میں انھیں ''شاعرِ مشرق'' کہا جانے لگا تھا۔ بے شک! اقبال جیسا شاعر نہ پہلے پیدا ہوا نہ اب ہوگا۔''

عبیر نے اپنی تقریر ختم کی۔ تالیوں کی آواز نے ماحول کے سکوت کو توڑا۔ تابش نے زوردار تالیاں بجائیں۔ لگتا تھا اُسے تقریر سب سے زیادہ پسند آئی ہے۔ سر منیر نے ہاتھ سے عبیر کو جانے کا اشارہ کیا۔ آخری مقرر آیا اور اپنی تقریر کر کے چلا گیا۔

''سر میرا خیال ہے مقابلے میں شرکت کے لیے عبیر ہی مناسب رہے گا۔'' تابش نے اساتذہ کے آگے اپنی رائے پیش کی۔

''میں تابش کی تائید کرتا ہوں۔'' عبدالرحیم نے بھی اپنا فیصلہ سنایا۔

''تم کیا کہتے ہو انصار؟'' سر ارشاد نے انصار کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''سر، عبیر کی تقریر تو زبردست ہے لیکن اُس کی ادائیگی بھرپور نہیں۔''

''گڈ!'' سر مجیب نے انصار کا کاندھا تھپتھپایا اور مسکراتے ہوئے بولے۔

''تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' اب کی بار سر منیر نے انصار کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''مانا کہ عبیر کا اسکرپٹ بے حد جاندار ہے لیکن اُس کی ادائیگی، لفظوں کا زیر و بم اور چہرے کے تاثرات درست نہیں۔

''اور ایکسپریشن یعنی اظہار کے بغیر مقابلہ جیتنا اتنا آسان کام نہ ہوگا۔'' سر ارشاد نے کہا۔

''لیکن ہم نے آٹھ مقرر سنے ہیں، اُن میں یہی سب سے بہتر تھا۔'' عبدالرحیم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اور اس حساب سے ہم نے سب سے اچھے مقرر کو چُنا ہے۔'' عبیر کے حق میں تابش نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''ہم آپ کی تجاویز کا خیر مقدم کرتے ہیں۔'' سر منیر نے کمیٹی کی کارروائی کو نتیجے تک پہنچاتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اپنی رپورٹ مرتب کر لی ہے۔ وہ شعبۂ اردو کے انچارج کو دی جائے گی۔ اس کے بعد وہ جو بھی فیصلہ کریں گے اُسے آپ لوگ پرسوں نوٹس بورڈ پر ملاحظہ کر لیجیے گا۔'' یہ کہہ کر سر منیر نے کمیٹی کا اجلاس ختم کرنے کا اعلان کیا۔

۹ نومبر کو علامہ اقبالؒ کی پیدائش کی تقریبات کے حوالے سے تعلیمی بورڈ کی جانب سے ایک تقریری مقابلے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس میں شرکت کے لیے تمام سرکاری و نجی اسکولوں کے نہم و دہم جماعت کے طالب علموں میں سے ہر اسکول کو

بہترین مقرّر بھیجنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

ان کے اسکول میں بھی اس مقابلے میں شرکت کے لیے بڑا جوش وخروش پایا جاتا تھا۔ اسکول کے پرنسپل ہمیشہ اس قسم کے اچھے اور معیاری کام کے خواہش مند رہتے تھے۔ انھوں نے اس مقابلے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس میں تین ٹیچر شامل تھے۔ جب کہ طالب علموں کی طرف سے نمائندگی کے لیے اسکول کے تین ذہین طالب علم بھی لیے گئے تھے تاکہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

تابش اور عبدالرحیم نے عبیر کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ جب کہ انصار کو اُس میں ادائیگی کے انداز وتاثرات کی کمی نظر آئی تھی۔ اساتذہ کے رویے سے بھی یہ محسوس ہورہا تھا کہ وہ عبیر کے حق میں نہیں ہیں۔ جب کہ اُن دونوں کا یہ خیال تھا کہ اگر اُسے موقع دیا جائے اور تیاری کرائی جائے تو وہ نہ صرف اچھی کارکردگی دکھائے گا بلکہ انعام بھی ضرور حاصل کرے گا۔

ایک روز انھوں نے کچھ اِسی بے چینی میں گزارا۔ اگلے روز آتے ہی تابش نے نوٹس بورڈ کا جائزہ لیا تو ایک حیران کن خبر پڑھنے کو ملی: کمیٹی کے فیصلے کے مطابق خالد جان اسکول ہٰذا کی طرف سے تعلیمی بورڈ کے تقریری مقابلے ''اقبال ..... ایک عظیم شاعر'' میں حصہ لیں گے۔

تابش نے ذہن پر زور دیا۔ نہم اور دہم میں خالد جان نام کا کوئی طالب علم نہیں تھا اور جن آٹھ لڑکوں نے ٹرائل دیے تھے یہ اُن میں بھی شامل نہیں تھا۔ پھر ایسا کیوں کر ممکن ہوا؟ تفریح کے وقفے میں اس نے سرشیرازی سے پوچھ ہی لیا:

''سر یہ خالد جان کون ہے؟''

''اوہ تو تم نے نوٹس بورڈ پڑھ ہی لیا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''سر، آپ نے بتایا نہیں؟'' اُس نے پھر سوال کیا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ وہ بولے۔'' خالد جان کو پرنسپل صاحب نے کل ہی داخلہ دیا ہے۔''

''لیکن داخلے تو کب کے بند ہو چکے ہیں!'' اس نے حیرانی سے کہا۔

''یہ اسپیشل کیس کے طور پر لیا گیا ہے۔''

''صرف تقریر کرانے کے لیے؟'' تابش نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''تم نے بالکل ٹھیک سمجھا!'' وہ سنجیدگی سے بولے۔

''لیکن کیوں سر؟ یہ ناانصافی ہے، حق تلفی ہے عبیر کی۔''

''کوئی حق تلفی نہیں ہے بیٹا۔ مجھے کمیٹی نے جو رپورٹ دی ہے اُس کے مطابق تمام طالب علموں میں کوئی بھی اس معیار کا مقرر نہیں کہ جو مقابلے میں جا کر مات دے سکے۔'' سر نے تفصیل سے کہا۔

''مگر ہم نے تو.....''

''دیکھو بیٹا! ٹی وی، کیبل اور انٹرنیٹ نے بچوں کو کسی اور طرف مصروف کر دیا ہے۔'' سر تابش کہہ رہے تھے۔ ''آج کل اسکولوں میں اس قسم کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے والے کم رہ گئے ہیں۔''

''لیکن ہیں تو سہی! سر۔''

''بالکل ہیں، لیکن ان کی کارکردگی ایسی نہیں کہ انھیں بڑے مقابلوں میں اسکول کے نامزد نمائندے کے طور پر بھیجا جا سکے۔''

''تو پھر؟''

''آج کل دوسرے اسکولوں میں بھی یہ رواج فروغ پا رہا ہے کہ اپنے شعبے کے ماہرین پروفیشنل کو اسکول کا طالب علم ظاہر کر کے مقابلے میں شرکت کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔'' وہ تفصیل بتا رہے تھے۔ ''اس طرح پروفیشنل یعنی پیشہ ور لڑکا کوئی نہ کوئی انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔''

''لیکن یہ تو دوسروں کا وطیرہ ہوا ناں۔''

''تم خود سمجھ سکتے ہو کہ دوسرے اسکولوں کے پروفیشنلز کے آگے ہمارا کمزور طالب علم نہیں چل سکے گا۔ اس لیے پرنسپل صاحب نے بھی اُسی طریقے پر چلنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''اور آپ نے اس فیصلے کی توثیق کر دی؟''

''ظاہر سی بات ہے میں ایک پرائیویٹ اسکول کا ملازم ہوں۔ مجھے اپنے اسکول کے مفادات کا خیال ہر حال میں رکھنا ہے۔'' انھوں نے اپنی عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور پھر مجھے اپنی نوکری بھی تو بچانی ہے۔''

''تو آپ نے اپنی نوکری بچانے کی خاطر ایک غلط فیصلے کو قبول کر لیا ہے۔'' وہ خاصا تلخ تھا۔

''اس میں آخر حرج ہی کیا ہے۔'' وہ بے اعتنائی سے بولے۔

''کیا؟'' وہ تقریباً چلا ہی تو دیا۔ ''کوئی حرج نہیں؟ حرج ہے سر بہت حرج ہے۔ آپ نے ہمیشہ ایمان داری اور سچائی کے راستے پر چلنے کی تلقین کی۔ آپ تو ہمیں اقبالؒ کا شاہین دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اقبالؒ جس نے یہ دعا کی تھی کہ۔

مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

''تمھارا کہنا بجا ہے بیٹا، لیکن یہ ہماری مجبوری ہے۔ اسکول کی عزت کا سوال ہے۔'' شیرازی صاحب بولے۔

''یہ کیسی عزت ہے سر کہ جس کے لیے ہمیں جھوٹ اور بے ایمانی کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ آپ نے تو کبھی مجبوری میں بھی ایمان داری اور سچائی کا ساتھ چھوڑنے کا درس نہیں دیا۔'' وہ قدرے تلملاتے ہوئے بولا۔

''بیٹا، ذاتی معاملات سے ہٹ کر اجتماعی معاملات میں کبھی کبھار اصولوں میں لچک پیدا کرنی پڑتی ہے۔''

''نہیں سر نہیں'' وہ چلایا۔ ''آپ تو میرا آئیڈیل تھے سر، آپ کی کہی ہوئی باتوں پر عمل کرنا میں اپنا فرضِ اولین سمجھتا تھا۔ میں نے کئی بار آپ کے قول پر عمل کرنے کے لیے نقصان بھی اُٹھایا لیکن سچائی کی خاطر وہ نقصان بھی برداشت کیا۔'' وہ فخریہ کہہ رہا تھا۔ ''لیکن آج آپ کی باتوں نے مجھے بہت دکھ پہنچایا۔'' وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

''تمھیں دکھی ہونے کی ضرورت نہیں ہم ان شاء اللہ مقابلہ جیت لیں گے۔''

شیرازی صاحب نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔

''ایسی جیت کا کیا فائدہ جو دھوکا دہی کے ذریعے حاصل کی جائے۔ ایک طرف اسکول کے حقیقی طالب علم کی حق تلفی ہو رہی ہے صرف انعام کے لیے۔'' وہ منہ بنا کر بولا۔ ''ایسی جیت پر بجائے خوشی کے ندامت ہوگی سر، ندامت۔''

''تم جذباتی ہو رہے ہو تابش۔ میں نے کہا نا کہ ہمیں پروفیشنلز کا مقابلہ کرنے کے لیے پروفیشنل کو آگے لانا ہوگا ورنہ ہم یہ بازی ہار جائیں گے۔'' شیرازی صاحب کو ہر لحظہ اپنے اسکول کی شان اور وقار کا خیال تھا۔

''بہر حال میں آپ کے فیصلے سے قطعی خوش نہیں ہوں۔'' وہ تھکے قدموں سے اپنے کلاس روم کی طرف جانے لگا۔

اگلے دو تین روز اُس نے شدید بخار میں کاٹے۔ اصولوں کی خلاف ورزی، ناانصافی اور دھوکا دہی کے اس من چاہے فیصلے نے اُس کے دل و دماغ پر شدید اثر ڈالا تھا۔ جس کے باعث وہ بیمار پڑ گیا اور اسکول بھی نہ جا سکا۔

۹ نومبر کا دن بھی آ ہی گیا۔ آج تعلیمی بورڈ میں علامہ اقبالؒ پر تقریری مقابلہ ہونا تھا۔ تابش کی طبیعت آج قدرے بہتر تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کیوں اس کے قدم تعلیمی بورڈ کی طرف اُٹھ گئے۔ وہ اپنی آنکھوں سے خالد جان کا ناکام چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ ان کا اسکول کوئی پوزیشن بھی حاصل نہ کر سکے۔ تاکہ وہ اپنے پرنسپل اور شیرازی صاحب کو چیخ چیخ کر بتا سکے کہ دیکھیے! دھاندلی سے بھی کہیں مقابلے جیتے جا سکتے ہیں؟ ارے جیت تو ہوتی ہے جذبے سے، سچائی سے اور ایمان داری سے۔

بورڈ کا آڈیٹوریم مہمانوں اور طالب علموں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مقابلہ شروع ہوا۔ مختلف اسکولوں کے طلبہ اپنی اپنی تقریریں سنا کر جاتے رہے۔ آخر اُس کے اسکول کا بھی نمبر آ ہی گیا۔ وہ اُسی پروفیشنل نمائندے کا منتظر تھا۔ لیکن جب طالب علم کا نام پکارا گیا تو اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ تقریر کرنے کے لیے اسٹیج پر خالد جان نہیں بلکہ عبیر آیا تھا۔ اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ عبیر نے تقریر شروع کی تو اُس کی خوشی اور بڑھ گئی۔ وہ لفظوں کی خوب صورت ادائیگی کے ساتھ چہرے اور

ہاتھوں کا بھرپور استعمال کر رہا تھا۔ وہ حیرانی اور خوشی کے ملے جلے جذبے کے ساتھ شیرازی صاحب تک جا پہنچا۔

''بیٹا میں اپنے اصولوں سے ہٹ کر اپنی نوکری بچانے چلا تھا۔ میں نے پرنسپل کی بات مان کر بڑی غلطی کی تھی۔'' شیرازی صاحب شرمندگی سے بولے۔ ''لیکن تمھاری گفتگو نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس دنیا میں تو ندامت سے بچ جاؤں گا لیکن اللہ کے سامنے کس منہ سے جاؤں گا۔ چناں چہ میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنا استعفا پرنسپل صاحب کی میز پر رکھ دیا۔''

''پھر سر؟''

''پھر انھوں نے مجھے اسکول کی ضرورت کے پیشِ نظر روک لیا۔ عبیر کو پھر سنا گیا۔ میں نے اس کی باقاعدہ تیاری کروائی اور پرنسپل صاحب نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔'' وہ خوشی سے بولے۔ ''اب تمھارا نامزد کردہ طالب علم اپنی کارکردگی پیش کر رہا ہے۔''

شیرازی صاحب کہہ رہے تھے اور تابش کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ عبیر کی بھرپور تقریر کے بعد تین چار اور تقریریں ہوئیں۔ منصفین نے جب نتیجے کا اعلان کیا کہ اول انعام کا حقدار عبیر ہے تو اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔

شیرازی صاحب نے اپنے رومال سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا:

''تابش! یہ عبیر کی نہیں ہمارے اسکول کی نہیں بلکہ تمھاری جیت ہے۔ یہ پہلا انعام دراصل تم نے حاصل کیا ہے۔ یہ ٹرافی سچائی اور ایمان داری کے نام ہے۔''

شیرازی صاحب اُسے داد دے رہے تھے اور اس کا سر فخر سے بلند ہو رہا تھا۔

راز

''میں کافی دنوں سے ایک اُلجھن کا شکار ہوں۔ میں نے خاصے اخبارات اور رسائل چھان مارے، بڑی بڑی شخصیات کی زندگی کا مطالعہ کیا لیکن مجھے ایک راز نہیں مل رہا جس کا جواب میں اپنے والد کو دے سکوں۔'' عبداللہ نے اپنے دوست فیاض سے کہا جسے پڑھنے لکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ وہ اپنی کلاس میں اکثر اوّل آتا۔ یوں تو عبداللہ بھی اچھا بچہ تھا مگر تعلیمی لحاظ سے فیاض سے کم تھا۔ فیاض کے لیے بھی اپنے دوست کی باتیں خاصی چیلنج کی حیثیت رکھتی تھیں ذرا توقف کے بعد وہ بولا:

''یار پہلے مسئلہ بتاؤ، لمبی چوڑی تمہید باندھنے سے فائدہ؟''

''دوست میرے والد نے مجھ سے پوچھا ہے کہ ایک نہایت کامیاب انسان کی کامیابی کا راز کیا ہے؟ ذرا معلوم کر کے دیکھو! اب تک میں کئی لوگوں کی کتب پڑھ چکا ہوں۔ کوئی دیانت دار بہت ہے تو کوئی ذہین وفطین بہت ہے، کوئی سیاست کا شہنشاہ تو کوئی کمال کا بازی گر۔ سائنس کسی کے گھر کی لونڈی ہے تو کہیں لفظوں کے جادو ہیں لیکن نہایت کامیاب انسان کی کامیابی کا راز میرے خیال میں تو مسلسل محنت اور جدوجہد میں پنہاں ہے۔ اب تم بھی کچھ بتاؤ!'' وہ دل کی باتیں کرتا چلا گیا۔ فیاض اُس کی باتیں سُن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لیکن مناسب جواب اُس کے پاس بھی نہ تھا۔

☆☆☆☆

فیاض کسی سوچ میں گم تھا کہ اُس کی والدہ نے اُسے بلایا۔

''کیوں بھئی، ہمارے بیٹا جی کس سوچ میں کھوئے ہیں؟'' انھوں نے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''امی میرے دوست عبداللہ نے ایک سوال پوچھا ہے، اُس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔'' اُس نے جواب دیا۔

''ریاضی کا سوال ہے تو اپنے ابو سے پوچھ لینا۔'' انھوں نے راہ سجھائی۔

''ارے نہیں امی بات کچھ اور ہے۔'' پھر اس نے امی کو ساری بات بتائی۔ ''اچھا تو یہ معاملہ ہے بیٹا! تمھارے دوست کے والد سمجھ دار آدمی ہیں۔

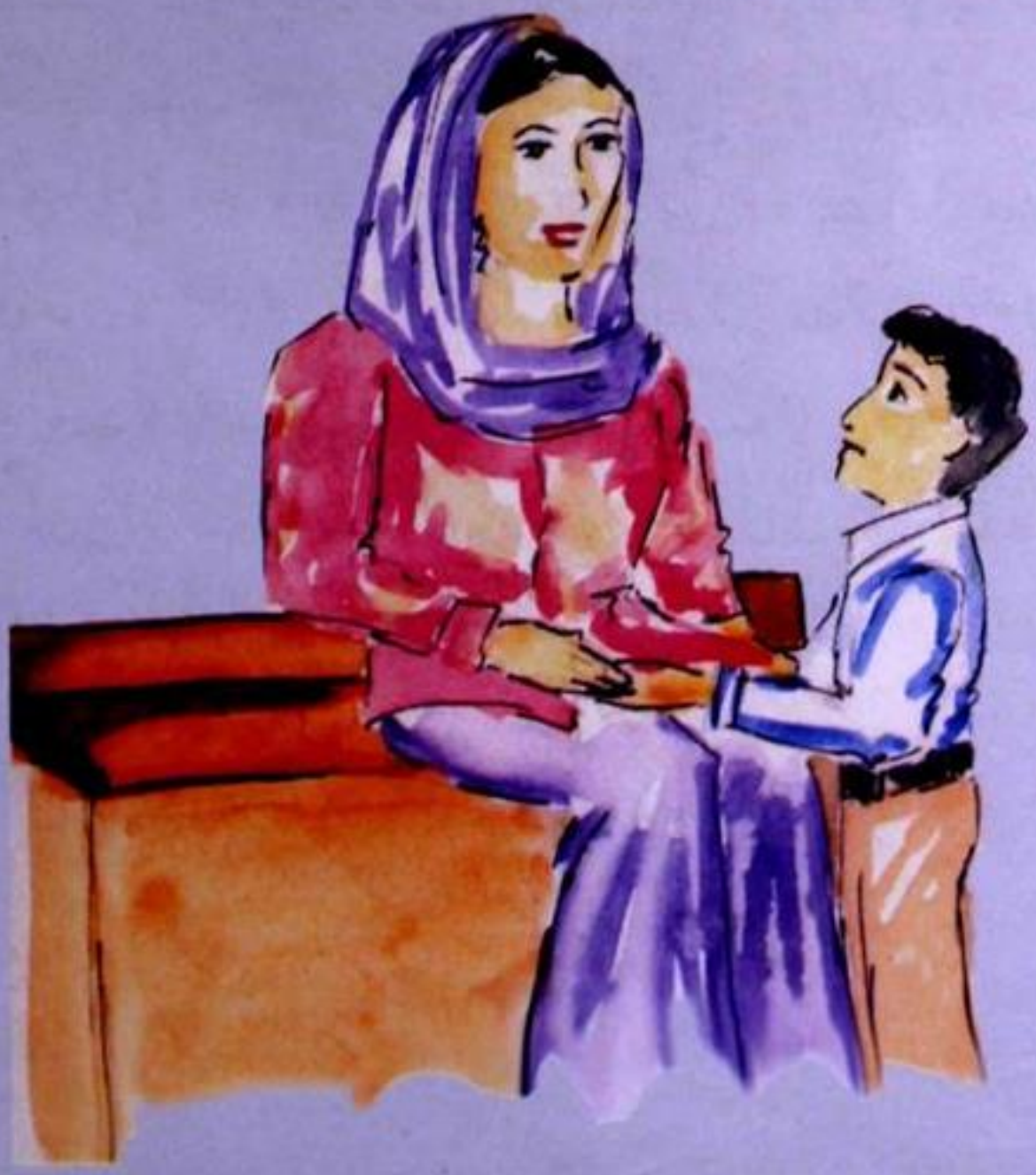

انھوں نے اپنے بیٹے کو اچھی راہ دکھانے کے لیے یہ سوال کیا ہے۔ دیکھ لو اس کی خاطر اُس نے کتنی کتابیں پڑھ لیں ہیں دوستوں سے گفتگو کر رہا ہے گویا اس طرح اُس کی شخصیت بن رہی ہے۔'' اُس کی ماں نے شفقت آمیز لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''امی جان! سب باتیں ٹھیک ہیں۔ لیکن میرا سوال ..... عبداللہ کو کیا جواب دوں؟'' وہ بے تابی سے بولا۔

اُس کی امی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''بیٹا! سب سے کامیاب انسان وہ ہے جو اپنے مالک کو پہچانتا ہو اور اُس کے محبوب کو عزیز رکھتا ہو۔''

''کیا مطلب امی؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''بیٹا! جس شخص نے اپنے خالق و مالک یعنی اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا، اُس پر دل سے ایمان لے آیا اور مالک کے سب سے عزیز بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا کہ اُن کے بعد کوئی نبی نہیں۔ میرے خیال میں وہ سب سے کامیاب انسان ہے۔ نبیؐ کی محبت ہی کامیابی کی کنجی ہے۔'' امی نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''امی! کوئی مثال؟'' فیاض سمجھ دار بچہ تھا۔ وہ بات کو کچھ کچھ سمجھ گیا تھا۔ سوال اچانک اور غیر متوقع تھا۔ امی جان نے ذرا توقف کیا پھر رُک کر بولیں۔

''مثلاً علامہ اقبال!''

''جن کی دعا ہم روزانہ صبح اسمبلی میں پڑھتے ہیں۔'' فیاض اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔

''ہاں بیٹا! اگر تم علامہ اقبالؒ کی زندگی کا جائزہ لو تو تمھیں اندازہ ہوگا کہ وہ

کس قدر کامیاب انسان تھے۔ عالم، فاضل، وکیل، شاعر، سیاستدان، گویا اپنی ذات میں ایک انجمن۔ آپ نے یہ راز پالیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اور یہی بات اُن کی کامیابی کا راز تھی۔ تم اُن کی شاعری پڑھ کر دیکھ لو۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

ایک بار علامہ اقبال کسی امیر آدمی کا مقدمہ لڑنے کے سلسلے میں اُس کے گھر پہنچے تو اُس نے علامہ اقبال کو رات اپنے گھر ٹھہرایا۔ گھر کیا تھا، ایک محل تھا۔ علامہ اقبال کو جو کمرہ ملا وہ گویا عشرت کدہ تھا۔ زندگی کی ہر نعمت وہاں موجود تھی..... نرم و گداز بستر بھی..... علامہ اقبال جب اُس کمرے میں پہنچے تو ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ آپ کا ملازم علی بخش وہاں موجود تھا۔ اُس نے رونے کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

''اس قدر نفیس و اعلیٰ قیام گاہ کو دیکھ کر مجھے اپنے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم یاد آ گئے جو کائنات کے شہنشاہ تھے مگر سوتے تھے کھجور کے پتوں پر۔ میں اُنؐ کا عاجز غلام ہوں۔ علی بخش! جاؤ، کوئی چارپائی اور تکیہ لے آؤ، میں ان نرم نرم بستروں پر آرام کی نیند نہیں لے سکتا۔''

علامہ اقبال کثرت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن کسی صاحب نے اُن سے پوچھا کہ آپ حکیم الامت کیسے بنے؟ تو انھوں نے جھٹ جواب دیا۔ پاک نبیؐ پر درود شریف بھیجنے سے! آپ کو نبی پاکؐ سے عشق تھا۔

بوڑھے ہو گئے تو دل کی یہ حالت تھی کہ نبی پاک ؐ کا نام سنتے ہی رونے لگتے تھے۔ بس بیٹا ساری باتیں تربیت سے آتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کی والدہ امام بی بی اور والد شیخ نور محمد دونوں دین دار تھے۔ انھوں نے شروع سے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت اس طرح سے کی کہ وہ اچھے انسان بنے۔ اپنی والدہ کی وفات پر آپ نے لوگوں کو بتایا کہ اُن کی ماں ہمیشہ نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات سے رہنمائی فرماتی تھیں۔ ایک بار جب علامہ ابھی نوجوان تھے جوش میں کسی بھکاری کو دھتکار دیا۔ یہ منظر آپ کے والد نے دیکھا تو غم گین ہو کر بولے ''اقبال کیا تو مجھے روزِ قیامت نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رُسوا کرے گا کہ میں اپنے بیٹے کی تربیت نہ کر سکا۔ حالاں کہ ہمارے رہبر و رہنما ﷺ نے ہمیشہ سوال کرنے والے کی مدد فرمائی۔'' آخر علامہ اقبال کو بھکاری سے بھی معذرت کرنی پڑی۔ بس میرے بچے! یہ ہے اصل راز کی حقیقت!'' امی جان نے تفصیل سے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆☆

اگلے روز عبداللہ بہت خوش تھا اور فیاض کو بھی چاکلیٹ کھلا رہا تھا جو اُس کے ابو نے اُسے ''راز'' معلوم کرنے پر انعام میں دی تھی۔

ہمدردی

کسی درخت کی ٹہنی پر اکیلا بُلبُل اداس سا بیٹھا تھا۔ وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔

''رات چھا گئی اور میں نے اُڑنے اور چگنے میں دن گزار دیا۔ اب میں اپنے گھونسلے تک کیسے پہنچوں گا۔ کیوں کہ ہر چیز پر اندھیرا چھا گیا ہے۔''

بُلبُل کا رونا چلانا سن کر ایک جگنو قریب ہی سے بول اٹھا۔ ''میں اگرچہ ننھا سا کیڑا ہوں مگر پوری طرح آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ اندھیری رات کا غم کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں راستے میں روشنی کروں گا۔ اللہ نے مجھے مشعل جیسی روشنی عطا کی ہے اور مجھے چمکا کر دیے جیسا بنا دیا ہے۔''

دنیا میں وہی لوگ اچھے ہوتے ہیں جو ضرورت کے وقت دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے

''زندگی اور خوابوں کا ساتھ صدیوں پرانا ہے..... ایجادات، تخلیقات اور کائنات کو خوبصورت بنانے کے لیے انسان ازل سے خواب دیکھتا آ رہا ہے۔''

مطالعۂ پاکستان کے استاد تنویر عالم اسٹیج پر مائیک کے سامنے کھڑے تھے۔ ''اسی طرح برِصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے پاک سرزمین کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا۔ یہ وطن اس خواب کی حسین تعبیر ہے اور یہ مقابلۂ مصوری علامہ اقبال سے

عقیدت کے اظہار کے طور پر منعقد کیا گیا ہے۔''

انھوں نے گویا شہر بھر کے اسکولوں کے مابین منعقدہ مقابلۂ مصوری کا مقصد بیان کیا۔ مقابلے میں شامل شاعر مشرق کی بڑی بڑی تصویروں سے اسٹیج کو سجایا گیا تھا۔ ہال بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ بعض بچوں کے والدین بھی آئے تھے اور مختلف اخبارات کے نمائندے اور فوٹو گرافرز بھی اس تقریب میں مدعو تھے۔ سب نتائج کے منتظر تھے۔ نتائج کے اعلان کے لیے تنویر عالم صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پہلی پوزیشن کے لیے نام سنتے ہی فخر اپنی جگہ سے اُٹھا اور مہمانِ خصوصی سے اپنا انعام وصول کرنے لگا۔ اس دوران ایک ساتھ کئی کیمروں کے فلش چمکے۔

''شاباش بیٹا!..... اچھے کاموں میں اسی طرح آگے بڑھتے رہنا۔'' مہمانِ خصوصی نے اسے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ نیچے اتر آیا اور دوسری، اس کے بعد تیسری پوزیشن لینے والے طالب علم اسٹیج کی طرف بڑھے۔

☆☆☆☆

کھانے کی میز پر فخر، فریحہ، ان کے ممی ڈیڈی اور دادو موجود تھے۔ ''ڈیڈی! آج آپ کے لیے میرے پاس ایک ایسی خبر ہے جو اچھی بھی ہے اور بُری بھی!'' فخر نے اپنے ڈیڈی کو مخاطب کیا۔

''واہ بھئی ..... کون سی ایسی خبر ہے جو بہ یک وقت بری ہے اور اچھی بھی؟'' مبین صاحب نے مصنوعی طور پر تشویش کا اظہار کیا۔

''کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے ڈیڈی!'' فریحہ بولنے لگی۔ ''یہ فخر تو بس

ایسے ہی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔''

''تم کیا جانو اس خبر کی اہمیت؟'' فخر اکڑ کر بولا۔ ''ممی واہ! ..... آپ بھی تو کچھ بولیں نا۔''

''لیکن بیٹا! ہمیں تو ایک ہی خبر کا پتا ہے جو اچھی ہے۔'' بیگم مبین نے کہا۔

''اور وہ ہم ہی سنا دیتے ہیں ..... فخر بیٹے نے آج مقابلۂ مصوری میں پہلا انعام حاصل کیا ہے۔'' دادو نے فخر کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''بہت خوب، فخر بیٹا! ..... '' مبین صاحب نے آہستہ سے تالی بجائی۔

''یہ تو واقعی اچھی خبر ہے، بری خبر یہ کیسے ہوئی؟''

''ڈیڈی! بُری خبر یہ آپ کی جیب کے لیے ہے ..... یاد ہے نا اپنا وعدہ آپ کو؟'' فخر نے ڈیڈی کو اپنا وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی۔

''خوب رہی فخر میاں!'' مبین صاحب پھر ہنسنے لگے۔ ''کس طرح گھما پھرا کر بات اپنے مطلب تک لے آئے۔ اوّل آنے پر کمپیوٹر دلانے کا وعدہ تو مجھے یاد تھا لیکن شروع میں تم نے اسے بُری خبر قرار دے کر مجھے الجھا دیا۔''

''ہاں تو فخر بیٹا! ..... کتنے میں آ جائے گا تمہارا کمپیوٹر؟'' بیگم مبین نے پوچھا۔

''دس ہزار میں آ جائے گا میرا کمپیوٹر ..... سیکنڈ ہینڈ ہے نا اس لیے۔'' فخر نے جواب دیا۔

''اور ڈیڈی میرے لیے .....'' فریحہ نے ڈیڈی کی توجہ اپنی طرف

دلائی۔

''ڈیڈی تمھارے لیے کوئی کیلکولیٹر لے دیں گے۔'' فخر نے اسے چڑانے والے انداز میں کہا۔

''دیکھیں نا ڈیڈی! پھر لڑائی میں پہل کر رہا ہے، پڑوسی ملک کی طرح۔'' فریحہ نے شکایت آمیز لہجے میں کہا اور فخر سمیت سب ہنسنے لگے۔

☆☆☆☆

ممتاز نعیمی اپنے اسکول کے شان دار آفس میں تشریف فرما تھے۔ تنویر عالم کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''تنویر صاحب!..... غالباً آپ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں؟'' ممتاز نعیمی نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''جج..... جی..... جی ہاں سر'' تنویر عالم ہچکچا رہے تھے۔

''پلیز آپ کھل کر بات کریں۔''

''سر! یہ بات تو آپ کے علم میں آ چکی ہے کہ چند دن پہلے میرا بیٹا ایک حادثے میں شدید زخمی ہو گیا تھا۔'' ''ہاں ہاں یاد ہے مجھے..... آپ نے دو دن چھٹی بھی کی تھی۔''

''میرے بچے کے سر پر اس چوٹ نے ایسا اثر کیا ہے کہ اس کی بینائی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے..... ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ فوری طور پر آنکھوں کا علاج ضروری ہے، ورنہ اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بے نور ہو جائیں گی۔'' تنویر عالم کے لہجے کا

کرب ان کی آنکھوں سے بھی ظاہر ہو رہا تھا۔

''ایک دو دن کی چھٹی تو میں دے دوں گا لیکن اس سے زیادہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' ممتاز نعیمی نے بھویں چڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں اندر آ سکتا ہوں؟'' فخر نے اجازت طلب کی۔

''آؤ بیٹے فخر..... تمھیں ایک خوش خبری سنانے کے لیے بلایا ہے۔ نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر ہم نے تمھیں بہترین طالب علم نامزد کیا ہے۔''

''شکریہ سر..... بہت بہت شکریہ۔''

''اب تمھیں اخلاق اور کردار کے لحاظ سے بھی خود کو بلند ثابت کرنا ہوگا۔'' ممتاز نعیمی نے اسے تاکید کی اور پھر تنویر عالم کو مخاطب کیا۔ ''تنویر صاحب آپ کو اور کچھ بھی کہنا تھا؟''

تنویر عالم صاحب فخر کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتے تھے، مگر پرنسپل نے خود بات کرنے پر مجبور کیا۔

''سر! مجھے تین ماہ کی تنخواہ ایڈوانس چاہیے اپنے بیٹے کے علاج کے لیے۔''

''ختم کریں تنویر صاحب یہ ڈراما اب..... آپ کا بیٹا بینائی سے محروم تو ابھی نہیں ہوا ہے نا۔'' ممتاز نعیمی نے اُن کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

''جب میرے بیٹے کی دنیا تاریک ہو جائے گی اس کی آنکھوں کی روشنی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی تو آپ کو اس ڈرامے کا انجام دکھانے اُسے یہاں

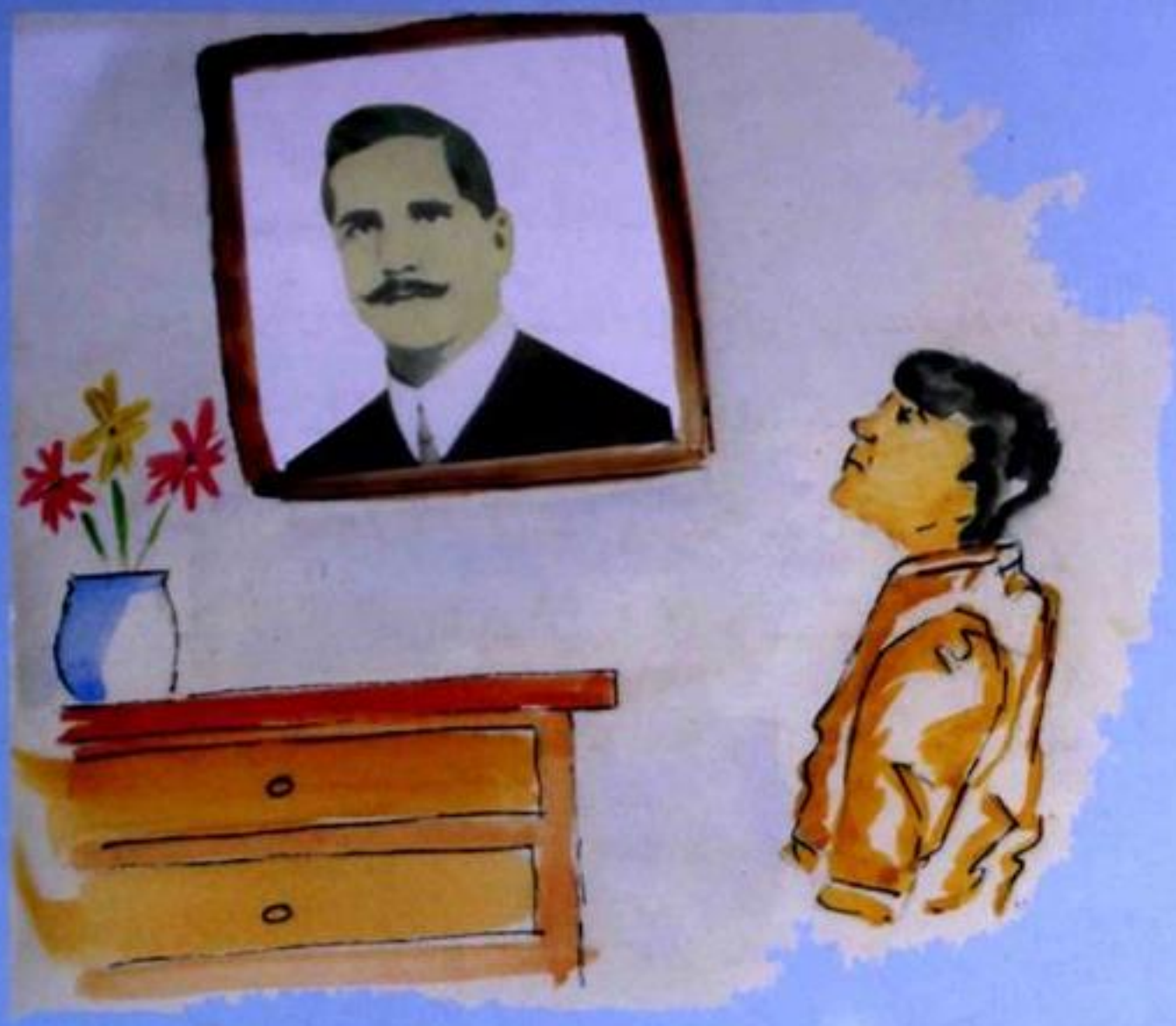

ضرور لاؤں گا۔'' تنویر عالم کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔ ان کی آنکھوں سے گالوں پر لڑھکتے آنسو فخر کو ساری کہانی سمجھا گئے تھے۔

☆☆☆☆

فخر اپنے گھر کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں شاعرِ مشرق کی تصویر کے سامنے کھڑا تھا۔ دادو آرام دہ کرسی پر جھول رہے تھے۔ وہ کافی دیر سے فخر کا جائزہ لے رہے تھے۔ انھوں نے فخر کی آنکھوں میں بے چینی اور گہرے دکھ کی تحریر پڑھ لی تھی۔

''آج ہمارے فخر بیٹا کن سوچوں میں گم ہیں انھیں کیا دکھ لاحق ہو گیا ہے؟''

''دادو! میرا اپنا کوئی دکھ نہیں ہے مجھے دکھ اپنے ٹیچر کے دکھ کا ہے۔'' فخر نے گہری سانس لی پھر بولا۔ ''انھیں اپنے بیٹے کی آنکھوں کے علاج کے لیے پیسوں کی

ضرورت تھی اور پرنسپل نے ان کی مالی امداد کی نہ اخلاقی ..... آنسوؤں میں بھیگا سرتنویر کا چہرہ اب بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔''

''ہوں ..... خاصا سنجیدہ مسئلہ ہے۔'' دادو اپنی عینک اتار کر صاف کرنے لگے۔

''مگر میں اس مسئلے کو ختم کرنا چاہتا ہوں ..... میں اپنے شفیق استاد کو مزید رنجیدہ دیکھنا نہیں چاہتا۔'' فخر نے دادو کو اپنی طرف متوجہ پایا تو بولتا چلا گیا۔

''دادو! میں کمپیوٹر نہیں خریدوں گا ..... کمپیوٹر کے ان پیسوں سے سرتنویر کے بچے کا علاج ہوگا اس کی آنکھیں روشن ہوں گی ..... اور یہ پیسے انھیں دینے کے لیے آپ بھی میرے ساتھ جائیں گے۔''

''فخر میاں! آج تم نے سچ مچ ہمارا دل جیت لیا ہے۔'' دادو کرسی سے اُٹھ کر علامہ اقبال کی تصویر کی طرف بڑھے۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے

''تم بہت اچھے ہو ..... اور صرف نام کے فخر نہیں بلکہ ہمارے لیے قابلِ فخر بھی ہو۔''

دادو نے آگے بڑھ کر فخر و محبت کے ملے جلے جذبات سے اسے گلے لگایا تھا، جب کہ سامنے تصویر میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاعرِ مشرق فخر کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں

کبوتر بڑا ہی خوبصورت تھا۔ سفید سفید سے چمکتے ہوئے پر ..... ننھے ننھے پروں سے لدی گردن اور خوبصورت صاف ستھرے لمبے لمبے پاؤں ..... ایسے جیسے ابھی ابھی دُھل کر آئے ہوں۔ اس کے سفید پروں سے جب سورج کی چمک دار روشن کرنیں ٹکراتیں تو عجیب و غریب شعاعیں سی نکلتیں محسوس ہوتیں، جنھیں دیکھنے والے مسحور ہو جاتے اور اندازہ نہ کر پاتے کہ وہ کوئی کبوتر ہے یا جادوئی کرشمہ ..... بھلا کوئی کبوتر اس قدر بھی خوبصورت ہو سکتا ہے ..... سوچنے والے سوچتے

اور دل کھول کر تعریف کرتے تو ذیشان کا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔

''یہ کبوتر بڑا نسلی کبوتر ہے بھائی جان!.....'' ذیشان نے مجھے بتایا۔

''لیکن مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں مُنّے .....'' میں نے بے زاری سے جواب دیا۔

''بھیّا..... سنیں تو سہی۔'' ذیشان گویا میرے پیچھے پڑ گیا۔

''یار مجھے ان کبوتروں کے بارے میں سن کر کیا فائدہ ملے گا کوئی کام کی بات کرو۔ تم کن فضول کاموں میں پڑے ہوئے ہو۔''

''بھیّا..... یہ کبوتر فضول تھوڑی ہیں..... دیکھیں تو سہی کتنے پیارے ہیں.....''

''پر اِن کا فائدہ کیا ہے؟..... مجھے بتاؤ.....''

ذیشان کو اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ بے ساختہ بولا۔ ''بھائی جان! یہ دیکھیے اس کے پر کتنے خوبصورت ہیں..... اور یہ کبوتر سدھایا ہوا بھی ہے۔ جہاں سے اڑے گا ٹھیک وہیں جا کر واپس اترے گا اور.....''

''لاحول ولاقوۃ.....'' میں جھنجھلا کر اُٹھ گیا۔

☆☆☆☆

کبوتر پالنے کا یہ کم بخت شوق ہمارے ''ماموں کبوتر'' اس گھر میں لے کر آئے تھے۔ انھیں شاید صدیوں سے کبوتر پالنے اور کبوتروں کے بارے میں طرح طرح کی عجیب وغریب معلومات اکٹھی کرنے کا شوق تھا۔ ہمارے گھر میں انھیں اور تو کوئی نہیں ملا البتہ میرا چھوٹا بھائی ذیشان مل گیا، جسے وہ اپنے علم اور ہنرمندی سے ہمہ وقت بہرہ مند

کرتے رہتے تھے۔ وہ تو چلے گئے مگر اپنے پیچھے اپنا ایک شاگرد چھوڑ گئے۔ جس نے ان کے جاتے ہی اپنے پَر پُرزے نکالنے شروع کر دیے۔ ماموں کے جانے کے تیسرے دن ہی ذیشان نے وہ کبوتر نہ جانے کہاں سے پکڑ لیا تھا جس کے بارے میں وہ مجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ بتانے کی کوشش کرتا رہتا۔

''بھیا! یہ کبوتر میری آواز پہچان لیتا ہے اور جب میں اسے بلاتا ہوں تو یہ میرے پاس بھی آ جاتا ہے'' میں نے اسے درمیان ہی میں ٹوک دیا۔

''یار ذیشان! یہ تم کن فضول کاموں میں پڑ گئے ہو۔ اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔'' میں اسے سمجھاتا.....

''بھیا! یہ میرا مشغلہ ہے اور فضول بھی نہیں ہے.....''

''اچھا! تو کیا ملتا ہے تمھیں اس کبوتر سے جس کے پیچھے تم ہر وقت پڑے رہتے ہو۔''

''ملتا تو کچھ بھی نہیں بھیا!'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''مگر اتنا مجھے معلوم ہے اللہ کی بنائی ہوئی کوئی چیز بھی بے کار اور فضول نہیں ہوتی۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنے سفید کبوتر کو لے کر چلا گیا جس کا نام اس نے ''ہیرا'' رکھا ہوا تھا۔ میں نے چند لمحے اس کی بات پر غور کیا لیکن ''اونہہ'' کہہ کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

☆☆☆☆

ایک دن امی جان نے مجھے بتایا کہ جب سے ذیشان کبوتر لے کر آیا ہے تب سے وہ سارا سارا دن باہر رہتا ہے۔ محلے کی کچھ عورتوں نے امی کو کانوں کان یہ خبر بھی پہنچا دی کہ وہ محلے کے ان کبوتر بازوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا ہے جن کی صحبت بہت

خراب تھی اور انھیں محلے میں کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ سن کر میں آگ بگولا ہو گیا۔

''امی جی! خبردار جو دوبارہ 'ماموں کبوتر' ہمارے گھر آئے۔''

''انھوں نے ہی میرے بھائی کو خراب کیا ہے۔'' میں غصے میں کافی اونچا بول رہا تھا۔

''اچھا ماموں کو چھوڑو! چھوٹے بھائی کو سنبھالو۔'' امی جی نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔

ذیشان کو میں نے بہت سمجھایا۔ وہ میرے سامنے تو جی ہاں جی ٹھیک ہے بھیّا! کہتا رہتا۔ مگر اسے جوں ہی موقع ملتا وہ چوری چھپے باہر نکل کر پھر انھی کبوتر بازوں میں جا بیٹھتا..... دن بدن معاملہ ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ میں اپنی مصروفیات کے سلسلے میں سارا دن گھر سے باہر رہا۔ شام کو گھر آیا تو معلوم ہوا ذیشان صبح سے گھر سے غائب ہے۔ نہ جانے کہاں گیا۔ امی کو بھی بتا کر نہیں گیا۔ میں نے امی کو ہمسایوں کے گھر بھیجا۔ امی جی نے آ کر بتایا۔

''آج ان کم بخت کبوتر بازوں کا ٹورنامنٹ تھا وہ ادھر ہی گیا ہوگا۔ ہائے میرا بچہ اسے کیا ہو گیا۔ ہائے اللہ!'' امی جی نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

''امی جی! آپ تو چپ کریں ..... کچھ نہیں ہوتا۔'' میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے امی جی کو دلاسا دیا مگر اندر سے میں خود بھی بے حد ڈرا ہوا تھا نہ جانیوہ کن لوگوں کے ساتھ تھا۔ جو وہ ابھی تک گھر واپس نہیں آیا تھا۔

ابھی اندھیرا نہیں پھیلا تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ پریشانی اور وسوسے میرے دل میں سایہ کر رہے تھے۔ بے اختیار میری نظر سیڑھیوں کے نیچے پڑے پنجرے پر پڑی جس میں وہی کبوتر بیٹھا..... غٹرغوں غٹرغوں ..... کر رہا تھا۔ جس کی تعریف کرتے ذیشان نہیں تھکتا تھا۔

''اس کم بخت کی وجہ سے میرا بھائی راستے سے بھٹک گیا تھا۔'' میں غصے میں آگے بڑھا اور پنجرہ اٹھالیا۔ ''نہ یہ کبوتر ہوتا نہ آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوتا۔''

میں نے غصے سے پنجرے کا دروازہ کھولا اور کبوتر کو دبوچ کر باہر نکالا اور اوپر

کی طرف اچھال دیا۔ کبوتر نے پر پھڑ پھڑائے اور دوسرے ہی لمحے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ''خس کم جہاں پاک.....'' میں نے نفرت سے کہا اور باہر کی طرف چل دیا۔

''کدھر جارہے ہو بیٹا۔'' امی جی نے سسکیاں بھرتے ہوئے پوچھا۔

''اس بے وقوف کو ڈھونڈنے.....'' میرا جواب تلخی سے بھرپور تھا۔

رات کا اندھیرا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ اور لوگ اپنے کام کاج سے فارغ ہوکر واپس اپنے گھروں کو لوٹ آئے تھے۔ مگر میں بہ دستور ذیشان کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ میں نے ذیشان کے تمام دوستوں اور ملنے والوں سے پوچھا اور تمام متوقع جگہوں پر بھی گیا لیکن اس کا کوئی اتا پتا نہ ملا۔ دو تین کبوتر بازوں سے بھی ملا پہلے تو وہ میرا سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لیتے پھر دُرشتی سے کہتے۔

''یہاں کوئی شان وان نہیں ہے بھائی جی جاؤ اپنا کام کرو.....'' میں مایوس ہو کر عشاء کی اذان سے پہلے گھر لوٹ آیا۔

امی جی نے میرے لٹکے ہوئے چہرے کو دیکھا تو زار و قطار رونے لگیں۔ آس پاس بیٹھی محلے کی کچھ عورتیں امی جی کو دلاسا دینے لگیں۔ مگر امی کے دل کو قرار کہاں تھا۔ اچانک پر پھڑ پھڑانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ ذیشان کا سفید کبوتر اڑتا ہوا سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کو ایک نظر دیکھا اور نظر ہٹانا چاہی۔ مگر اچانک ٹھٹک کر رہ گیا۔ کسی نے ایک کاغذ پھاڑ کر اس کے گلے سے لٹکایا ہوا تھا۔ میں یک لخت کھڑا ہوگیا اچانک میرے دل کی دھڑکنیں زور زور سے دھک دھک کرنے لگیں میں ذیشان تک پہنچ چکا تھا۔ رات گیارہ بجے میں اور ذیشان گھر پہنچے

تو امی جی کا رو رو کر برا حال تھا۔ ذیشان بھاگ کر امی جی کے گلے سے لگ کر زار و قطار رونے لگا۔

''کہاں چلا گیا تھا تو میرے بچے؟'' امی جی نے روتے ہوئے پوچھا۔

''بس امی جی مجھے معاف کر دیں آئندہ ایسا نہیں ہوگا '' امی جی نے اسے گلے لگا لیا۔

''اچھا بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟'' میں نے حالات قدرے بہتر ہونے پر دریافت کیا۔

''شرط ہارنے پر دوسری پارٹی نے ہمیں حویلی میں قید کر دیا تھا۔ اور دھمکی دی کہ تمھارے گھر والوں سے شرط کے پیسے وصول نہ کر لیں، تمھیں نہیں چھوڑیں گے۔ اچانک دیوار پر مجھے ہیرا بیٹھا نظر آیا۔ میں نے مخصوص آواز نکال کر اسے اپنے پاس بلایا اور حویلی میں پڑے ردی کے کاغذ پر کوئلے سے لکھ کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ چناں چہ اس طرح ہیرا اُڑ کر واپس گھر چلا آیا جہاں آپ نے وہ سارا پیغام پڑھا اور پولیس کو لے کر حویلی پر چھاپا مارا اور ہماری جان چھڑوائی۔''

اتنا کہہ کر ذیشان چپ ہو گیا۔ لیکن اس کی آنکھیں شرمندگی اور آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اچانک وہ اٹھا اور پنجرے کو اٹھا کر اس کا دروازہ کھولنے لگا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' میں نے اس سے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے نہیں چاہیے یہ کبوتر۔'' اس کا لہجہ روہانسا ہو گیا۔

''نہیں پگلے یہ کبوتر تو بڑے کام کی چیز ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کچھ چھوٹی چیزوں کے بڑے بڑے فائدے ہوتے ہیں۔'' میں اٹھ کر اس کے پاس آ گیا اور کبوتر کو پکڑ کر بولا۔ ''ویسے بھی کبوتر تھوڑی ہے۔ یہ تو ہیرا ہے ہیرا۔''

''مگر بھیا.....'' ذیشان نے بولنا چاہا مگر میں نے فوراً علامہ اقبال کا ایک شعر پڑھا۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ذیشان کے ہاتھ میں موجود کبوتر نے غٹرغوں غٹرغوں کہہ کر گویا ہاں میں ہاں ملائی۔

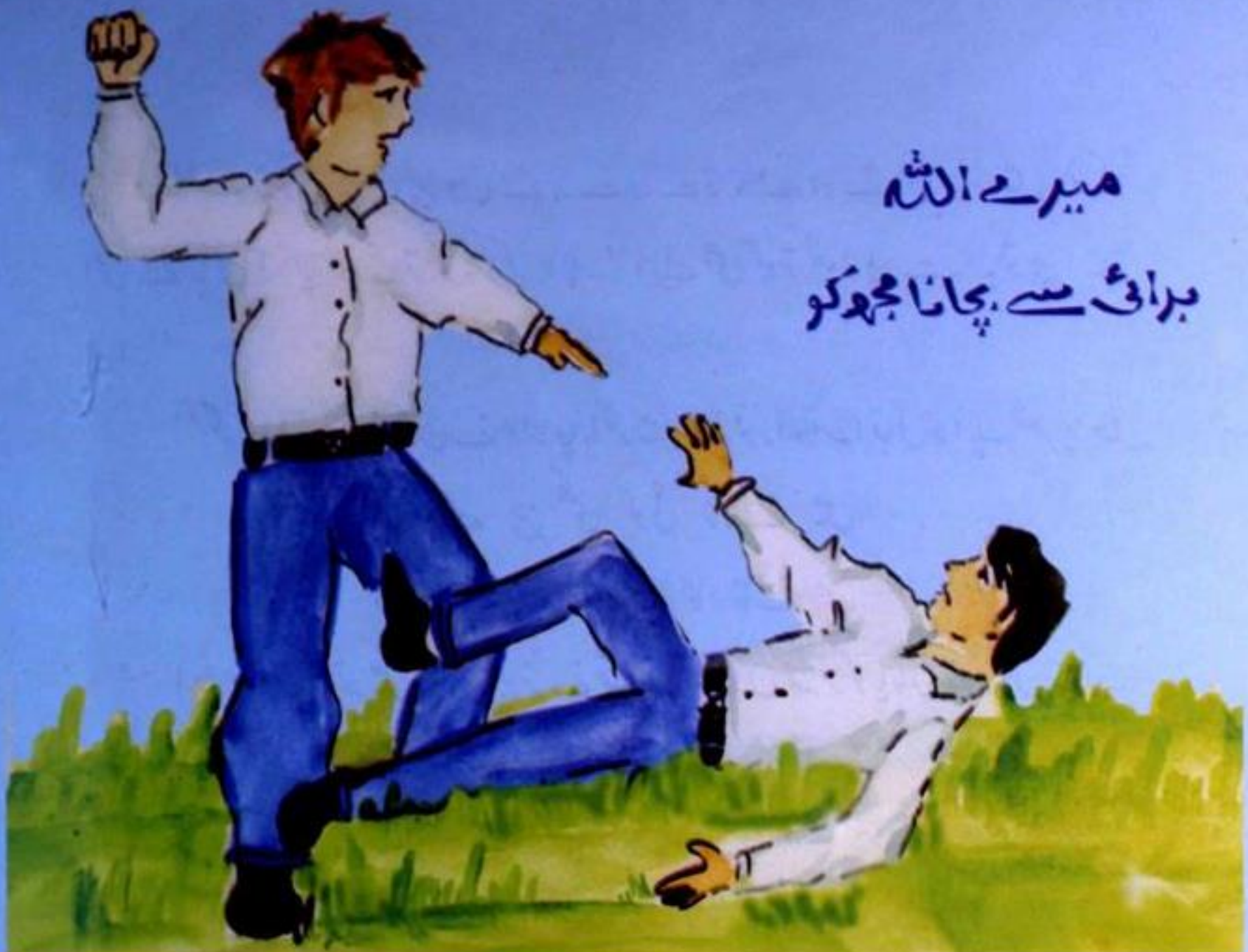

''اور مارو، اور زور سے۔''

''ایک ہاتھ اور دو، خوب مارو۔''

''ہمت کرو، جانے نہ پائے۔''

''گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو، مارو مارو خوب مارو۔''

عباس نے اپنے دوستوں کی آوازیں سنیں اور شہزاد کو ایک زوردار گھونسا مارتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگ فکر مت کرو۔ یہ آج بچ کر نہیں جائے گا۔ میں اس کی ایسی مرمت کروں گا کہ یہ عمر بھر یاد رکھے گا۔''

اتنی دیر میں شہزاد سنبھل چکا تھا۔ اس نے بستہ ایک طرف رکھ کر عباس پر جوابی حملہ کیا۔ اب اس کے دوست اس کی ہمت بڑھانے کے لیے نعرے لگا رہے تھے۔ اس نے اپنے دانتوں سے نکلنے والے خون کو زمین پر تھوکتے ہوئے کہا ''اس نے شاید مجھے کمزور سمجھ لیا ہے۔ میں فولادی دیوار ہوں۔''

''یارو یہ فولادی دیوار نہیں، ریت کی دیوار ہے۔ نری ریت کی دیوار۔'' عباس فوراً بولا۔

وہ دونوں پھر گتھم گتھا ہو گئے۔ ان کے دوستوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ عباس نے شہزاد کو زمین پر دے مارا۔ وہ چکرا سا گیا اور اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔

''بولو اب ماسٹر جی سے میری شکایت کرو گے؟ بولو جواب دو۔'' عباس نے شہزاد کو گریبان سے پکڑ کر کہا۔

شہزاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عباس کی کامیابی پر اس کے دوستوں نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔ شہزاد زمین سے اٹھا تو اس کے دوستوں نے اس کی ہمت بندھائی۔ ''شہزاد حوصلہ مت ہارو اس مرتبہ ہار ہوئی ہے تو اگلی دفعہ جیت ہو گی۔'' یہ آواز انجم کی تھی۔

''ہاں ..... ہاں ..... کوئی بات نہیں ..... آئندہ دیکھ لیں گے عباس کو۔'' الیاس بھی بول پڑا۔

''اگلے مقابلے میں دیکھ لوں گا، بڑا آیا سورما۔'' شہزاد اپنے کپڑوں سے مٹی جھاڑتے ہوئے بولا۔ پھر سب لڑکے اپنے اپنے بستے کندھوں پر ڈالے گھروں کی طرف چل پڑے۔

شہزاد اور عباس ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ہم جماعت ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے روایتی حریفوں کی طرح لڑتے رہتے تھے۔ ان کے درمیان جھگڑے کی ابتدا اس دن ہوئی تھی جب ماسٹر صاحب جماعت میں داخل ہوئے تو بلیک بورڈ پر ایک کارٹون بنا ہوا تھا اور اُس کے نیچے لکھا تھا، ''یہ ماسٹر صاحب ہیں۔''

''ماسٹر جی! یہ کارٹون عباس نے بنایا ہے۔'' شہزاد نے اتنا کہا تو ماسٹر صاحب عباس کی طرف بڑھے۔

''یہ کارٹون تم نے بنایا ہے؟'' ماسٹر صاحب کے 'مولا بخش' کے ڈر سے عباس نے بڑی آسانی سے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔ سچ بولنے پر وہ سزا سے بچ گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''شہزاد! تم چھٹی کے وقت اسکول سے باہر نکلنا۔ میں تمھیں دیکھ لوں گا۔''

اس نے اپنی دھمکی کو اس وقت سچ ثابت کر دکھایا جب اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر شہزاد کی خوب پٹائی کی۔ دونوں کے جھگڑے کی خبر ہیڈ ماسٹر صاحب تک جا پہنچی تھی۔ انھوں نے دونوں کو دس منٹ مرغا بنا کر اپنے دفتر سے رخصت کر دیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں کے درمیان نفرت کی دیوار بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ اب دونوں اپنا علیحدہ علیحدہ گروپ بنا چکے تھے۔ لڑکوں کے لیے تو یہ ایک مشغلہ بن گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو مارتے اور باقی لڑکے اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

وہ منگل کا دن تھا جب اسمبلی سے جماعت کی طرف جاتے ہوئے بے خیالی میں عباس کے پاؤں کی ٹھوکر شہزاد کو لگی تھی۔ اُس نے ناگوار انداز میں عباس کو گھورا تو اس نے کہا۔

''میں نے جان بوجھ کر تمھیں ٹھوکر نہیں ماری۔''

''تم نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ میں تم سے اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔ میں تمھیں دیکھ لوں گا۔'' شہزاد دھمکیوں پر اتر آیا تھا۔ اب چھٹی کے بعد اسکول سے باہر سخت لڑائی کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ دونوں کے حمایتی سارا دن سرگوشیوں میں اس متوقع مقابلے کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ تفریح کے وقفے میں کھیلتے ہوئے عباس کو چوٹ لگ گئی جس کی وجہ سے وہ چھٹی سے پہلے ہی گھر چلا گیا۔ یوں چھٹی کے بعد متوقع لڑائی کا خطرہ ٹل گیا۔ دو روز بعد عباس اسکول آیا تو رمضان المبارک

کے مقدس مہینے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی دن اسکول میں ۹ نومبر کے حوالے سے یومِ اقبالؒ کا خصوصی پروگرام بھی تھا۔ اس پروگرام میں بچوں کو بہت سی مفید باتیں سننے کو ملیں۔

''اب دیکھو دونوں کس طرح غور سے باتیں سن رہے ہیں، مگر چھٹی کے وقت یہ ساری باتیں انہیں بھول جائیں گی۔'' عدنان نے شہزاد اور عباس کی طرف اشارہ کر کے جمیل کے کان میں سرگوشی کی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ لڑتے ہوئے تو یہ ایک دوسرے کے جانی دشمن دکھائی دیتے ہیں۔'' جمیل نے کہا۔ ''آج بھی چھٹی کے وقت ان کے درمیان لڑائی کا خدشہ ہے۔ شہزاد آج اس سے ٹھوکر مارنے کا بدلہ لے گا۔''

''تمھیں یہ سب کیسے معلوم ہوا ہے؟'' اختر نے سوال کیا۔

''اسمبلی کے وقت میں نے خود شہزاد کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ آج عباس میری مار سے بچ کر نہیں جائے گا۔'' عدنان بولا۔

چھٹی کے بعد شہزاد نے عباس کا راستہ روکا تو وہ بولا: ''میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔''

''میں بھی تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔''

شہزاد کا جواب سن کر عباس نے پوچھا: ''تو پھر کیا چاہتے ہو؟''

''دوستی، صرف دوستی۔'' شہزاد بولا۔

''مجھ سے کیوں دوستی کرنا چاہتے ہو۔'' عباس نے پوچھا۔

''اس کی ایک وجہ ہے۔ تم مجھ سے کیوں لڑنا نہیں چاہتے؟'' شہزاد نے بھی

سوال کر ڈالا۔

''میں تم سے نہیں لڑنا چاہتا اس کی بھی ایک وجہ ہے۔''

''وہ وجہ کیا ہے؟'' بلال بھی بول پڑا۔

''وہ وجہ یہ ہے کہ میری دادی اماں نے بتایا ہے کہ روزے کی حالت میں کسی سے لڑتے جھگڑتے نہیں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ حضور اکرمؐ کی حدیث ہے کہ کتنے ہی بدقسمت روزہ دار ایسے ہیں جن کو اپنے روزے سے سوائے بھوک پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میرا روزہ ہے اس لیے میں شہزاد سے لڑنا نہیں چاہتا۔''

عباس کی بات سن کر شہزاد بولا۔ ''ایک وجہ تو یہی ہے جو عباس نے بیان کی ہے مگر نہ لڑنے کی ایک وجہ اور بھی میرے پاس ہے۔''

''وہ کیا وجہ ہے؟'' سروش نے پوچھا۔

''وہ وجہ سامنے اسکول کی دیوار پر لکھی ہوئی ہے۔ شہزاد کی بات سن کر لڑکوں نے دیوار پر نگاہ ڈالی تو اس پر علامہ اقبالؒ کا یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

میرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

''ہم سب ہی اسمبلی میں روزانہ یہ دعا پڑھتے ہیں۔ آج سے پہلے میں نے اس دعا پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ یومِ اقبال کے پروگرام میں اردو کے استاد کی زبانی اس دعا کا مفہوم معلوم ہوا تو بے اختیار میری زبان پر آیا کہ اے اللہ میری دعا قبول فرما۔ میں نے اُسی لمحے ہال میں بیٹھے ہوئے عہد کیا تھا کہ میں عباس سے نہیں لڑوں گا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے میری دعا قبول ہوگئی ہو۔ اللہ نے مجھے عباس سے لڑنے کی

برائی سے بچالیا ہے۔ آؤ عباس میرے گلے لگ جاؤ۔''

شہزاد کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ عباس فوراً اس کے گلے لگ گیا۔ دونوں کی صلح کے بعد ان کے حمایتیوں نے بھی ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔ انھیں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ سب اسمبلی میں جو دعا مانگتے ہیں، آج قبول ہوگئی ہے۔

ملاقات

میں کرسی پر بیٹھا سوچوں میں گم تھا کہ گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ امی نے کچن سے آواز لگائی۔ ''یاسر بیٹا! دروازے پر کوئی آیا ہے۔'' امی جان کچن میں کھانا بنا رہی تھیں۔

'' اچھا امی جان! دیکھتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں کرسی سے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کم از کم میرے دوستوں میں سے تو کوئی نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ان سے تو میں ابھی مل کر آیا ہوں۔

یہ سوچتے ہوئے میں نے دروازہ کھولا۔ میرے سامنے ایک جانی پہچانی بارعب شخصیت موجود تھی۔ ایک ایسی شخصیت جسے میں جانتا تھا لیکن نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس شخصیت نے سفید رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے اور چہرہ نور سے دمک رہا تھا۔ میں حیرانی کے عالم میں اُس شخصیت کو دیکھے جا رہا تھا کہ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''السلام علیکم!'' اور میری طرف دایاں ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھی اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا اور پرجوش انداز میں ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے ان کے سلام کا جواب دیا۔ اتنے میں اندر سے امی جان کی آواز سنائی دی۔

''یاسر بیٹا! کون ہے؟'' میں پھر سوچ میں پڑ گیا کہ اس شخصیت کا نام کیا ہے اور امی کو کیا جواب دوں۔ اس دوران امی نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ میں نے

فوری طور پر کوئی جواب دیے بغیر اس شخصیت کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں انھیں سیدھا ڈرائنگ روم میں لے آیا اور باادب انداز میں کہا۔

''سر! آپ یہاں پر تشریف رکھیے۔'' یہ کہہ کر میں کچن کی طرف لپکا۔ امی جان کچن میں ہی موجود تھیں۔ میرے کچن میں داخل ہوتے ہی امی جان نے دوبارہ یہی سوال کیا۔

''بیٹا کون آیا ہے؟'' مجھے کوئی جواب نہ مل رہا تھا۔ امی جان حیرت سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ بالآخر میں نے کہا۔

''امی جان! ہمارے ہاں ایک ایسے مہمان آئے ہیں جنھیں میں جانتا ہوں پر نام یاد نہیں آ رہا۔'' امی جان حیرت سے بولیں۔

''ایسی کون سی شخصیت ہے جس کا تمھیں نام یاد نہیں آ رہا حالاں کہ تمھارا حافظہ تو بہت تیز ہے۔''

''اچھا امی جان! نام بھی یاد آ جائے گا فی الحال ایک کپ چائے اور بسکٹ ڈرائنگ روم میں بھجوا دیجیے۔'' یہ کہہ کر میں کچن سے باہر آ گیا۔

جوں ہی میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ شخصیت بے چینی سے کھڑی ہو گئی۔

''بیٹا! ویسے تو جنت کی لذتیں چھوڑ کر مجھے یہاں آنے کی ضرورت نہ پڑتی لیکن فرشتوں کے طعنے سن کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔'' وہ قدرے جذباتی ہو کر بولے۔

جنت کا نام سن کر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میں فوراً بول اٹھا۔

''تو کیا اس دنیا میں بھی کسی علاقے کا نام جنت ہے؟ کیا فرشتے آپ کے دوست ہیں؟'' میرے اس سوال پر وہ بزرگ مسکرائے اور مجھے سمجھانے کے انداز میں بولے۔ ''نہیں بیٹا! یہاں پر کوئی جنت نہیں ہے بلکہ میری تو موت واقع ہو چکی ہے اور اس وقت میری روح تمھارے سامنے موجود ہے۔''

ان بزرگ کی بات سن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ چند لمحے خاموشی کے بعد انھوں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! مجھے بہت افسوس ہے کہ یہ دنیا دوزخ بن گئی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ اتحاد سے رہتے اور دینِ اسلام پر عمل کرتے لیکن مسلمانوں کا حال تو کافروں سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ جب مسلمان ہی مسلمان کا دشمن بنا ہوا ہے تو کافروں سے کیا شکوہ کرنا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا کہ اُس وقت کے مسلمانوں نے حق کی سربلندی کے لیے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں مگر اسلام پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔ لیکن آج کل کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ کافر اور مسلمان کو ایک ساتھ کھڑا کر دیا جائے اور کسی سے کہا جائے کہ ان میں سے مسلمان کی شناخت کرو تو وہ یقیناً شناخت نہیں کر پائے گا۔ کیوں کہ مسلمانوں نے بھی وہی رنگ ڈھنگ اپنایا ہوا ہے جو کہ کافروں کا ہوا کرتا ہے۔ فرشتے ہر وقت مجھے یہی طعنے دیتے رہتے ہیں کہ اس قوم کو تم نے شاعری کے ذریعے جگایا تھا وہ قوم دوبارہ سو گئی ہے۔ اور ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ کبھی نہ جاگ پائیں گے اور سوتے سوتے ہی انھیں موت آ جائے گی۔

فرشتوں کی انھی باتوں نے مجھے دوبارہ یہاں آنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے

اللہ سے گڑگڑا کر دعا کی کہ مجھے ایک دفعہ کچھ دیر کے لیے دنیا میں جانے کی اجازت دی جائے۔ شاید میری بات کسی پر اثر کر جائے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر خاص کرم فرمایا اور مجھے اس دنیا میں آنے کی اجازت دے دی۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ میری رہنمائی کے لیے ایک فرشتہ بھی بھیجا ہے جو تمھاری چھت پر موجود ہے۔ راستے میں میں نے فرشتے سے مشورہ کیا کہ کس گھر میں جا کر تبلیغ کرنی چاہیے۔ اس نے مشورہ دیا کہ نوجوانوں پر تمھاری بات کا زیادہ اثر ہوسکتا ہے۔ لہٰذا میں نے تم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یاسر میاں! میں تم سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں۔''

میں ان بزرگ کی باتوں سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ میں نے فوراً کہہ دیا۔ ''جناب! میں آپ کی ہر بات مانوں گا۔''

میرے اس جواب پر وہ بہت خوش ہوئے اور بولے۔

''شاباش میرے بچے! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب میری بات غور سے سنو! میں تمھیں ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کے سنہری اصول بتا رہا ہوں۔

۱۔ آپس میں لڑائی مت کرنا۔

۲۔ ایک اللہ کے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکنا۔

۳۔ چاہے حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہو جائیں۔ دینِ اسلام سے نہ ہٹنا۔

۴۔ دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے ساری زندگی کوشش کرتے رہنا۔

۵۔ کبھی کسی مسلمان پر ظلم نہ کرنا اور نہ ہونے دینا۔

میں تو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ لیکن اب یہ ذمہ داری تمھیں نبھانی ہے۔

تمھارے اندر سچے جذبے کا ہونا ضروری ہے۔ یہ اسلام اور کفر کی جنگ ہے۔ یہ جنگ تمھیں ہر قیمت پر لڑنی ہوگی۔ چاہے اپنے قلم کے ذریعے یا اپنے ہتھیار کے ذریعے۔ غیر مسلم کبھی مسلمان کا دوست نہیں ہوسکتا۔ اس پر کبھی بھروسا مت کرنا اور اس سے کبھی بھیک مت مانگنا۔ اپنے اللہ پر توکل کرنا اور اپنے قوتِ بازو کو آزمانا۔

ایک مشورہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اپنی زندگی کو سادہ بناؤ اور فضول خرچی سے بچو۔ پیسے سے کبھی محبت مت کرو۔ کیوں کہ پیسا آنی جانی شے ہے اور اس سے ایمان جاتا رہتا ہے۔ پیارے پاکستان کے لیے جان حاضر رکھو۔ کیوں کہ اسے حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائی گئیں۔ غیر مسلم مسلمانوں کے خلاف ایک بہت بڑا منصوبہ بنا رہے ہیں تمھیں چاہیے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو جگاؤ۔''

ان بزرگ کی باتیں سن کر شرمندگی کا احساس مجھ پر غالب آنے لگا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج کل واقعی ایسا ہو رہا ہے جس کی نشان دہی بزرگ ہستی کر رہے ہیں۔ نیک بزرگ کی بات سنتے ہی میں نے ان سے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔

''جناب! موجودہ حالات واقعی ایسے ہیں جس طرح آپ نشان دہی کر رہے ہیں۔ ہم مسلمانوں کی نالائقی کی وجہ سے ہی آپ کو فرشتوں کا طنز برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سر! میں اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنا تن من دھن وقف کروں گا اور اگر میری جان بھی لبوں پر آ گئی تو پھر بھی حق کہنے سے باز نہیں آؤں گا۔ جناب! اب آپ بالکل بے فکر ہو جایئے۔ کیوں کہ اب آپ کو فرشتوں کے ذریعے بہت اچھی اچھی خبریں ملا کریں گی۔''

میری بات سن کر وہ بزرگ بہت خوش ہوئے اور مجھے گلے لگا لیا۔ اور امتِ مسلمہ کے حق میں دعا کی۔ اس کے بعد انھوں نے 'السلام علیکم' کہا اور اچانک غائب ہو گئے۔ اس موقع پر میرے دل میں یہ شدید خواہش تھی کہ کاش وہ چند لمحے میرے پاس اور ٹھہر جاتے۔

اتنے میں ببلو میاں چائے اور بسکٹ لے کر ڈرائنگ روم میں آن پہنچے اور ڈرائنگ روم میں مجھے اکیلا دیکھ کر تعجب سے بولے۔

''یاسر بھیا! آپ کے مہمان کہاں ہیں؟ یاسر بھیا! وہ کون تھے؟''

میں نے پھر بے یقینی کے انداز میں کہا۔

''میں نے انھیں کئی بار دیکھا ہے لیکن نام ابھی تک یاد نہیں آ رہا۔

''یاسر بھیا! نام بھی یاد آ جائے گا۔ اب اٹھ جایئے۔ کیوں کہ صبح کے سات بج گئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں بھی ماسٹر جی سے سزا ملے۔'' ببلو میاں کا شور شرابا سن کر میری آنکھ کھل گئی لیکن میرے دماغ میں ایک بوجھ تھا۔ وہ یہ کہ وہ شخصیت کون تھی جو مجھے بیدار کرنے آئی تھی۔ اسکول جانے کی تیاری کرتے ہوئے میں اِنھی سوچوں میں کھویا رہا۔

ببلو میاں نے کل اپنا ہوم ورک مکمل نہیں کیا تھا۔ اس لیے وہ اردو کی کتاب سے ہوم ورک کرنے میں مصروف تھے۔

''ببلو میاں مجھے تو آپ نے جگا دیا لیکن اب آپ کی وجہ سے اسکول سے دیر

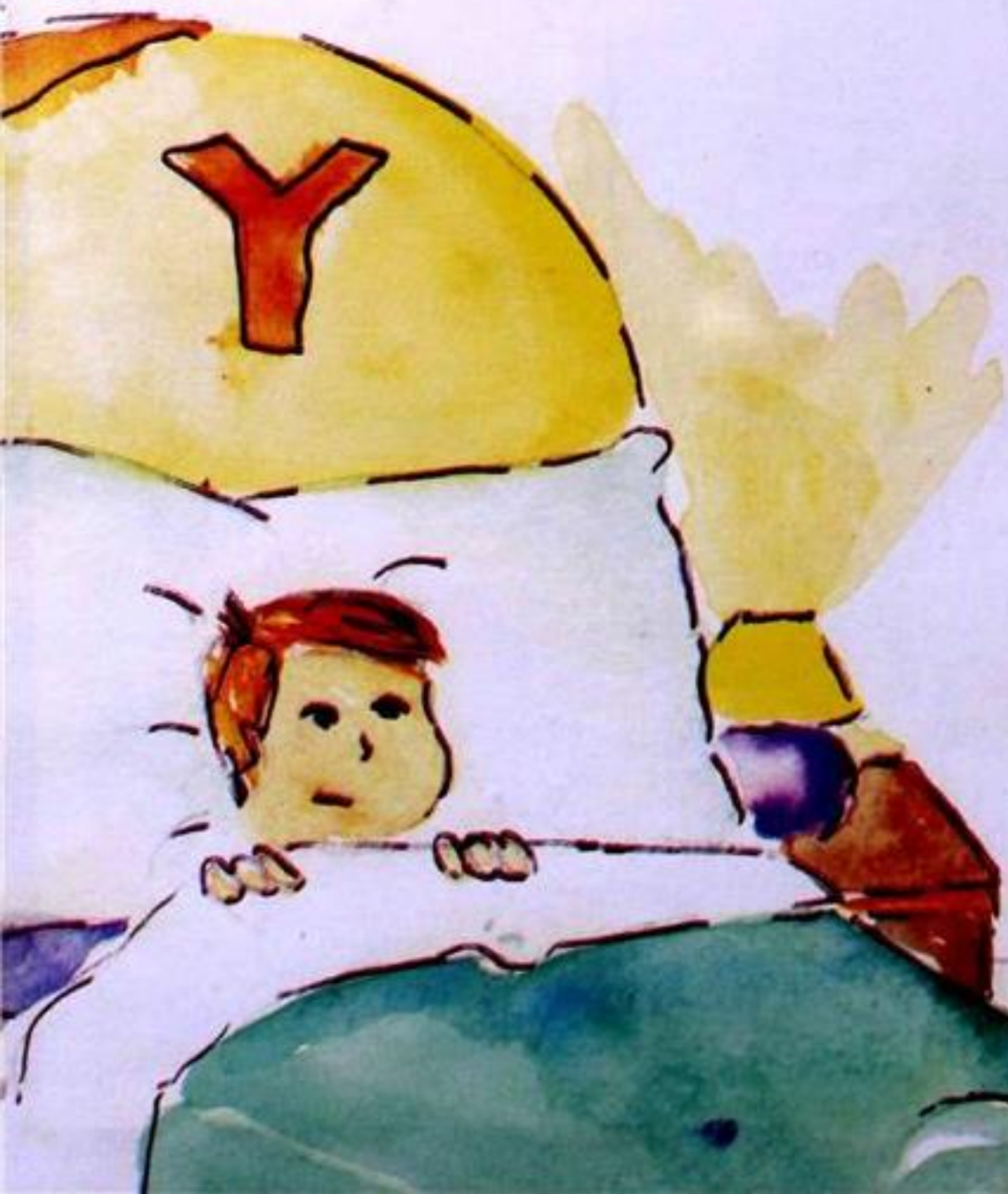

ہو جائے گی۔'' میں یہ کہتے ہوئے ببلو میاں کے سر پر پہنچ گیا لیکن جب یہ دیکھا کہ ببلو میاں نے کون سا صفحہ کھولا ہوا ہے تو حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کیوں کہ ببلو کی کتاب پر اُسی شخصیت کی تصویر بنی ہوئی تھی جن سے رات کو خواب میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا، ''شاعرِ مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال''.....

اب میں سمجھ گیا تھا۔ علامہ اقبالؒ اس قوم کو دوبارہ بیدار کرنے آئے تھے۔

ایک گائے اور بکری

ایک ہرا بھرا گھاس کا میدان تھا جہاں انار اور پیپل کے سایہ دار درخت تھے۔ صاف شفاف پانی کی ندیاں جاری تھیں۔ ہر طرف بہار کا سماں تھا۔ پرندے اس خوب صورت اور ٹھنڈی آب و ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اُن کے چہکنے کی آوازیں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ غرض یہ منظر بیان سے باہر تھا۔ ایسے میں ایک ندّی پر ایک بکری چرتے چرتے آ نکلی۔ جب وہاں ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا تو پاس ہی ایک گائے کو کھڑے پایا۔

بکری نے اسے جُھک کر پہلے سلام کیا پھر نہایت اچھے طریقے سے اس کے ساتھ

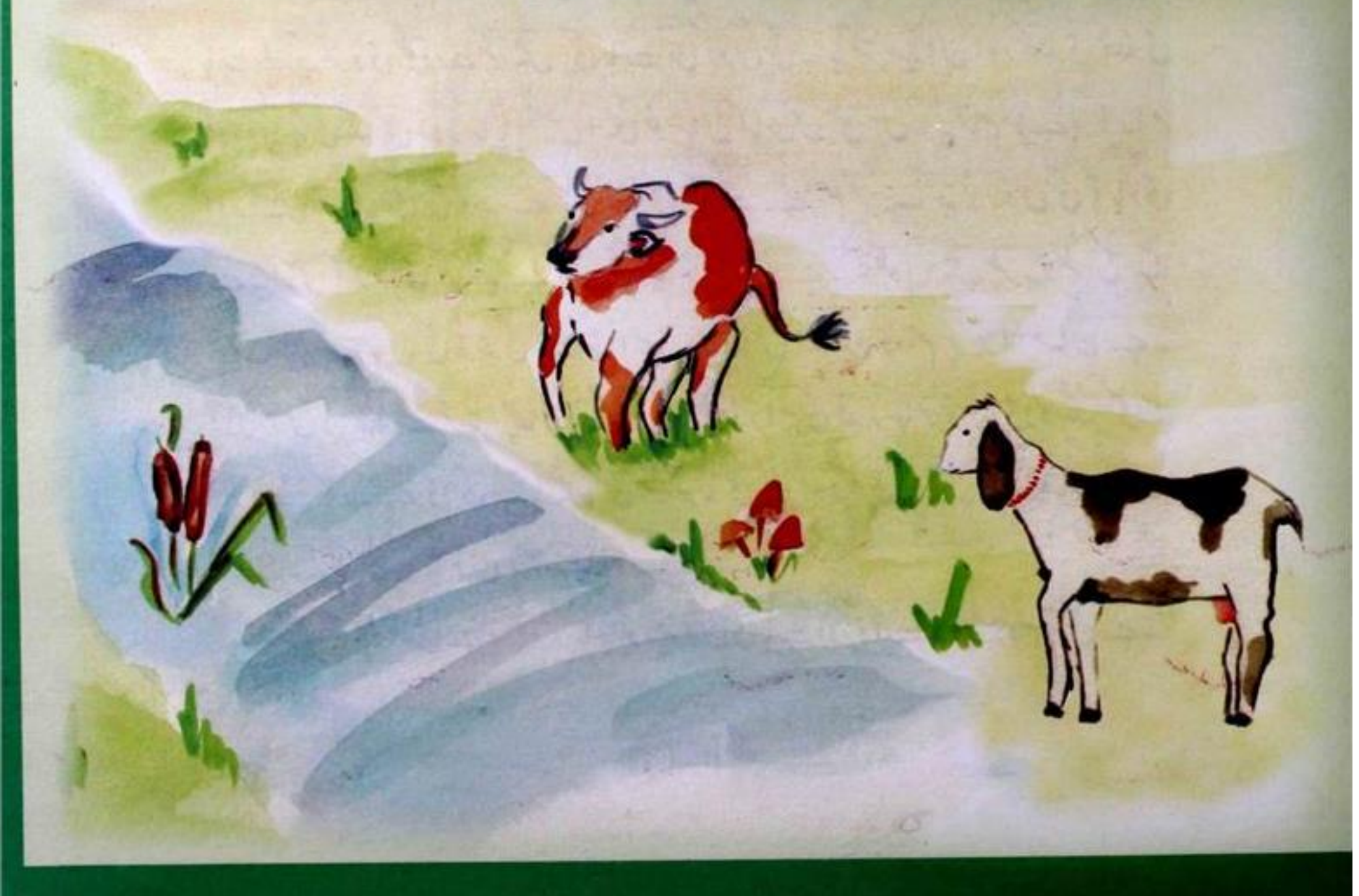

بات چیت شروع کی۔ ''بڑی بی! آپ کے مزاج کیسے ہیں؟''

گائے بولی۔ ''میرا مزاج اچھا ہی ہے۔ اپنی زندگی بُری بھلی گزر رہی ہے۔ میری زندگی تو دُکھ میں ہے۔ بہت مشکل حالات ہیں۔ اپنا نصیب ہی بُرا ہے۔ کسی کو کیا کہا جا سکتا ہے۔ میں خدا کی شان دیکھ رہی ہوں اور بڑوں کو بُرا بھلا کہہ رہی ہوں۔ کوئی آدمی سے بھلائی نہ کرے،، خدا کرے اس کے ساتھ کسی کا واسطہ نہ پڑے۔ دودھ کم دوں تو شکایت کرتا ہے۔ اگر میں کمزور ہو جاؤں تو بیچ دیتا ہے۔ مختلف طریقوں سے مجھے غلام بنائے رکھتا ہے۔ اور دھوکا دے دے کر مجھے قابو میں رکھتا ہے۔ میں اس کے بچوں کو اپنے دودھ سے پال کر طاقت ور بناتی ہوں۔ نیکی کے بدلے یہ بُرائی کرتا ہے میں تو بس اللہ ہی سے فریاد کرتی ہوں۔''

بکری نے یہ سارا قصہ سن کر کہا۔ ''یہ شکایت اور شکوہ کرنا اچھی بات نہیں۔ سچی بات گرچہ کڑوی لگتی ہے مگر میں سچی بات ہی کہوں گی۔ یہ سبز میدان اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، یہ ہری گھاس اور سایا، ہمیں ایسی خوشیاں کہاں مل سکتی ہیں۔ یہ تمام مزے، آرام اور نعمتیں آدمی ہی کی وجہ سے ہیں۔ اُسی کی وجہ سے ہم غریب جانوروں کی آبادی ہے۔ ہمیں آزادی کی بجائے اس کی قید ہی اچھی ہے۔ جنگلوں میں طرح طرح کے خوف ہیں۔ وہاں کی زندگی سے خدا بچائے۔ اس انسان کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ ہمیں اس کی شکایت کرنا اچھا نہیں لگتا۔ اگر تم آرام کی قدر جانو تو آدمی کا گِلہ کبھی نہ کرو۔'' گائے بکری کی یہ باتیں سن کر شرما سی گئی اور اپنی باتوں پر پچھتانے لگی۔ گائے نے بکری کی باتوں پر غور کیا اور کہنے لگی۔

''اگرچہ بکری ہے تو چھوٹا سا جانور مگر اس کی بات اور ذات بڑی معلوم ہوتی ہے۔''

مُقدّر کا ستارہ

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے مِلّت کے مقدر کا ستارہ

ڈاکٹر اسفند یار اور ڈاکٹر فیصل دونوں بچپن سے بڑے گہرے دوست تھے۔ دونوں ایک ساتھ پروان چڑھے تھے۔ اپنے وطن میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد چند جدید کورسز کے لیے دونوں ملک سے باہر گئے تھے اور کچھ عرصہ قبل ہی یورپ سے بچوں کے مخصوص امراض میں خصوصی تعلیم حاصل کر کے واپس آئے تھے۔ وہ شہر کے دو مختلف ہسپتالوں میں الگ الگ ملازمت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر فیصل ناک، کان اور گلے کی بیماریوں کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ نوزائیدہ بچوں کے علاج میں بھی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ جب کہ ڈاکٹر اسفند یار ہڈیوں کے امراض کے ماہر سرجن اور پولیو سے متاثرہ بچوں کے امراض کے جدید اور کامیاب آپریشن میں مہارت رکھتے تھے۔

دونوں دوستوں کو اپنے وطن میں ملازمت کرتے ہوئے ابھی چند مہینے ہی ہوئے تھے، لیکن اپنے وطن کے نظام میں موجود خرابیوں پر وہ اکثر بہت کڑھتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر فیصل نے تو کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو اس ماحول کا عادی بنا لیا تھا۔ مگر ڈاکٹر اسفند یار کی حساس طبیعت اُنھیں اندر ہی اندر اپنے ملک کے ماحول سے

CHILDREN'S
OSPITAL
AM BULANCE

بیزار کر رہی تھی۔ وہ اکثر ڈاکٹر فیصل سے اس بات کا ذکر کرتے کہ میں ان حالات میں زیادہ دیر تک ملازمت جاری نہیں رکھ سکتا اور بہت جلد یہ ملک چھوڑ جاؤں گا۔ ڈاکٹر فیصل یہ باتیں سُن کر ڈاکٹر اسفندیار کو سمجھاتے کہ اُنھیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے نظام میں بہت سی خرابیاں ہیں جس کی وجہ سے ایک فرض شناس، ایمان دار اور با اُصول آدمی کے لیے یہاں کام کرنا مشکل ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو کر ملک ہی چھوڑ دے۔ اگر ہمارے ملک کے ہُنر مند، ماہر اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد اسی طرح بیرون ملک جاتے رہے تو ہمارا ملک تو خالی ہو جائے گا۔ اور ایسے مسائل کا شکار ہو جائے گا کہ جن کا حل دشوار ہوگا۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ یہیں رہ کر ان مسائل اور خرابیوں کو دور کریں۔ آپ معذور بچوں کا کامیاب علاج کر کے نہ صرف اُن کی محرومی دور کر رہے ہیں بلکہ انھیں مستقبل کی سہانی امید بھی دلا رہے ہیں۔ میں نے یہ جذبہ بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے جس کا صلہ دُنیا و آخرت دونوں میں ملے گا۔ ڈاکٹر فیصل کی اس طویل اور حوصلہ افزا گفتگو کے باوجود ڈاکٹر اسفندیار مطمئن نہ ہوئے۔

ایک دن ڈاکٹر فیصل اپنے بیٹے کی سال گرہ کی دعوت دینے کے لیے ڈاکٹر اسفندیار کے گھر گئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ اُداس اور بجھے بجھے سے ہیں۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد ڈاکٹر فیصل نے اپنے دوست سے اُداسی کا سبب پوچھا۔ ڈاکٹر اسفندیار کے چہرے پر کچھ ناگواری کے تاثرات اُبھرے پھر کچھ توقف کے بعد بولے:

''فیصل! آپ کو تو پتا ہے کہ مجھے روزانہ چار پانچ بچوں کے آپریشن کرنے

ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے شعبے میں مریضوں کی تعداد باقی شعبوں سے زیادہ ہے۔ آج کل پولیو کے خاتمے کے لیے چلائی جانے والی مہم کے باوجود ملک میں بہت سے متاثرہ بچے موجود ہیں جن کا کئی دوسرے ہسپتالوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ہسپتال میں بھی علاج ہو رہا ہے۔ ہمارے ہسپتال میں چند ڈاکٹروں نے اپنی اجارہ داری قائم کی ہوئی ہے۔ اکثر اوقات میرے آپریشن کا وقت تبدیل کر دیا جاتا ہے اور جب میں تبدیل شدہ وقت کے مطابق آپریشن تھیٹر جاتا ہوں تو اس وقت وہاں کوئی اور ڈاکٹر اپنے مریض کے ساتھ آپریشن میں مصروف ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے شدید اُلجھن اور ذہنی تکلیف ہوتی ہے۔ اس طرح میرا وقت بھی ضایع ہوتا ہے اور مریض کے لواحقین بھی متاثر ہوتے ہیں اور ان پر مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ انھیں اس حال میں دیکھ کر مجھے اس قدر اذیت ہوتی ہے کہ میں خود کو مجرم سمجھنے لگتا ہوں۔ ایسا اس لیے ہے کہ چند ڈاکٹر میری بڑھتی ہوئی شہرت کی وجہ سے پیشہ ورانہ رقابت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ میڈیکل سپریٹنڈنٹ سے شکایت بھی کی ہے لیکن وہ یہ کہہ کر مجھے خاموش کرا دیتے ہیں کہ خود کو اس نظام کا حِصہ بنانے کی کوشش کرو۔ پرسوں جب میں دوبارہ اُن کے پاس اپنی شکایت لے کر پہنچا تو وہاں موجود ڈاکٹر فرید نے مجھے کہا کہ آپ کو اپنے سینیر ڈاکٹر کا احترام کرتے ہوئے ان سے پوچھ کر شیڈول بنانا چاہیے اور اگر کسی دن کوئی آپریشن رہ جائے تو اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اُن کی یہ بات سُن کر بڑی مایوسی ہوئی۔ میڈیکل سپریٹنڈنٹ اس وقت بھی خاموش تھے اس لیے میں نے بھی ڈاکٹر فرید کو کوئی جواب نہیں دیا۔''

''یہ تو واقعی بڑی تشویش کی بات ہے۔ تمھیں چیرمین صاحب اور سینیر میڈیکل سپریٹنڈنٹ صاحب سے بات کرنی چاہیے۔ کیوں کہ اُنھوں نے ہی تمھیں ملازمت کی پیش کش کی تھی اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تمھارا تبادل ملنا آسان نہیں۔'' ڈاکٹر فیصل نے اپنے دوست کی طویل گفتگو سننے کے بعد کہا۔

''چھوڑیں جی ..... میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں نے تو استعفا دینے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس کا مجھے کوئی غم بھی نہیں ہے۔ مجھے کسی بھی بیرونی ملک میں یہاں سے پانچ گنا زیادہ تنخواہ ملے گی اور ذہنی سکون بھی حاصل ہوگا۔ یہاں تو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہے اور میں مزید غلط روّیے بھی برداشت نہیں کرسکتا۔'' ڈاکٹر اسفندیار نے گویا اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

''نہیں بھئی ..... میں اپنے پیارے دوست کو اس طرح وطن چھوڑنے نہیں دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے ملک میں کسی بھی کام کی پذیرائی اس قدر نہیں جتنا ایک با صلاحیت انسان اُس کا مستحق ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کے جانے سے بہت سے معصوم اور بیمار مریضوں کا نقصان ہوجائے گا۔ وہ لوگ جن کی نظریں آپ جیسے ہمدرد محبِّ وطن انسان پر لگی ہوئی ہیں اُن کے لیے کون مسیحا بنے گا؟'' ڈاکٹر فیصل بھی انتہائی جذباتی ہورہے تھے۔

''نہیں بھئی ..... میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ مجھے اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ اس وطن اور ان پھول سے بچوں کو میری ضرورت ہے، لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس ملک کا سارا نظام کھوکھلا ہوچکا ہے اور صحیح سمت سفر کرنے والوں کے

لیے یہاں پر کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں تو یہاں خدمت کے جذبے سے آیا تھا لیکن انتہائی رنجیدہ ہوکر یہاں سے جانے کا فیصلہ کر رہا ہوں۔'' ڈاکٹر اسفند یار دکھ بھرے لہجے میں بولے۔

''اسفند بھائی! میں بھی اپنے ہسپتال میں چند مسائل کا شکار ہوں لیکن آپ کچھ زیادہ ہی حساس آدمی ہیں اس لیے کچھ زیادہ ہی مایوسی کا شکار ہوگئے ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ کو ہر قیمت پر یہاں رُکنا ہوگا۔'' ڈاکٹر فیصل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا جس پر اسفند یار اُن کی باتوں سے کسی حد تک قائل ہوگئے اور بولے۔

''بھئی جانا تو میں خود بھی نہیں چاہتا، لیکن مجبور ہوکر یہ فیصلہ کیا ہے۔ مجھے خود اپنے وطن اور اس کے نونہالوں سے بڑی محبت ہے۔ اگر آپ کے پاس میرے مسئلے کا کوئی حل ہے تو مجھے بتا دیں۔''

''کیوں نہ ہم دونوں مل کر اپنا ہسپتال کھول لیں۔'' ڈاکٹر فیصل نے کہا۔

''آپ کی تجویز بہت اچھی ہے لیکن اس کے لیے اتنا سرمایہ کہاں سے آئے گا؟''

''آپ ہاں تو کریں۔ خدا نے چاہا تو سارا بندوبست ہوجائے گا۔'' ڈاکٹر اسفند یار اپنے دوست ڈاکٹر فیصل کی بات مان گئے۔

دوسرے دن شام کے وقت ڈاکٹر فیصل اور ڈاکٹر اسفند یار کار میں بیٹھے شہر کی مصروف ترین سڑک سے گزر رہے تھے۔ راستے میں ڈاکٹر فیصل نے بتایا کہ وہ اس وقت ایک نیک اور مال دار شخصیت حاجی عثمان سے ملنے جا رہے ہیں جو میرے انتہائی قریبی واقف کار ہیں۔ اور خُدا نے اُنھیں بے حساب دولت کے ساتھ ایک بڑا دل

بھی عطا کیا ہے۔ اُن کی سربراہی میں ہمارے ملک میں کئی ٹرسٹ ہسپتال کام کر رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اُن سے قرض لے کر اپنا ایک چھوٹا سا ہسپتال قائم کر لیں۔ میری اس سلسلے میں اُن سے ٹیلی فون پر بات ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر اسفند یار اپنے دوست ڈاکٹر فیصل کی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوئے۔ حاجی عثمان نے اُن دونوں کا پُر تپاک استقبال کیا اور ہسپتال بنانے کے لیے اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ اور اُنھیں ہسپتال کے لیے کوئی مناسب جگہ دیکھنے کے لیے بھی کہا۔

تین دن کی ان تھک محنت کے بعد انھوں نے شہر کے وسط میں ہسپتال کے لیے ایک انتہائی مناسب جگہ تلاش کر لی اور حاجی عثمان کو بھی جگہ کے متعلق بتا دیا۔ جس پر وہ مطمئن ہو گئے۔ اور دونوں کے جوش و جذبے کی بہت تعریف کی۔ حاجی عثمان نے انھیں قرض کی رقم کا چیک دیتے ہوئے کہا:

''بھئی میں تمھاری لگن اور ان تھک محنت سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ تم واقعی وطن سے محبت کرنے والے نوجوان ہو۔ قوم کو تم جیسے نوجوانوں کی بڑی ضرورت ہے جو آنے والی نسلوں کی حفاظت کریں۔ میری دُعا ہے کہ خُدا تمھیں کامیابی عطا کرے۔''

اس کے بعد چند ضروری کاغذات پر دستخط ہوئے اور دونوں دوست حاجی عثمان کی طرف سے دی گئی رقم کا چیک لے کر پرسکون انداز میں گھر واپس آ گئے۔ اگلے چند دنوں میں اُنھوں نے ہسپتال کے لیے دیکھی ہوئی جگہ خرید لی۔ اور چند دنوں کے بعد ایک پُر وقار تقریب میں ہسپتال کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تو وہاں حاجی عثمان اور شہر کے دوسرے معزز افراد بھی موجود تھے۔ یہ لمحات ڈاکٹر فیصل اور ڈاکٹر اسفند یار

دونوں کے لیے انتہائی خوشی کے تھے۔ ڈاکٹر اسفند یار تصور کی آنکھ سے معذور بچوں کو بھلے چنگے اپنے قدموں پر چلتا اور بھاگتا دوڑتا دیکھ رہے تھے۔

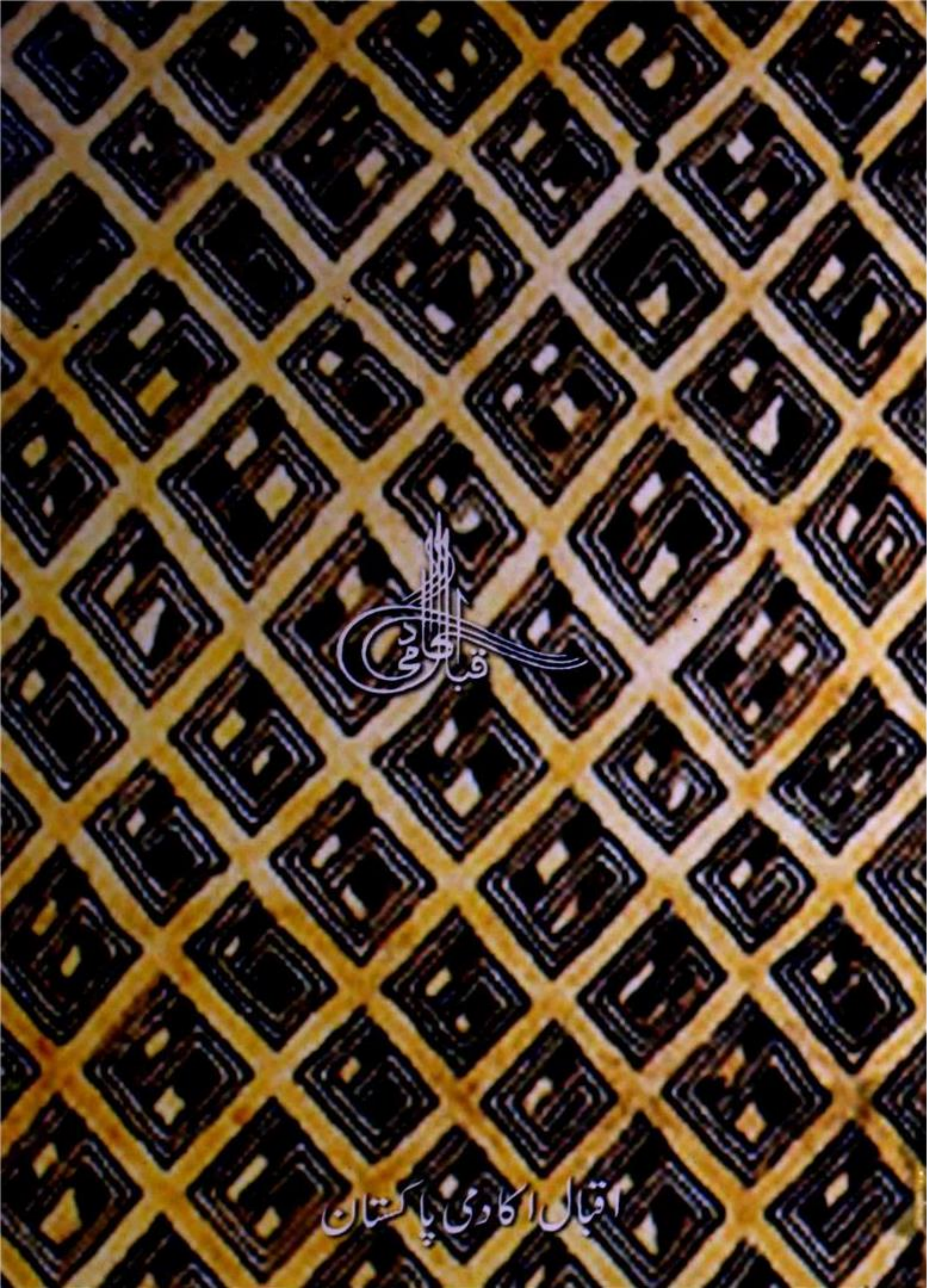

اقبال اکادمی پاکستان